اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا ششماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۵ء)

اقبال ریویو

(خصوصی اشاعت)

پروفیسر صلاح الدین کے مضامین

(افکارِ تازہ.....اشاعتِ ثانی)

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، انڈیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا ششماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۵ء)

اقبال ریویو

(خصوصی اشاعت)

پروفیسر صلاح الدین کے مضامین

(افکارِ تازہ.....اشاعتِ ثانی)

زیر اہتمام

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

جلد (۲۵) شمارہ (۱)

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی
(لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ سید امتیاز الدین
(معتمد اقبال اکیڈیمی وایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۷۵ روپے

ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۱۵۰ روپے

بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ۔ حیدرآباد۔ 5000028

تلنگانہ (انڈیا)۔ فون۔ 040-66663950, 23323950

e-mail:ihfiqbalacademy@gmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ اقبال اکیڈیمی میں کی گئی۔

ISBN. : 81- 86370- 62- 5

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے شارپ کمپیوٹرس، چادر گھاٹ، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

(اقبال ریویو۔اپریل ۲۰۱۵ء)

خصوصی اشاعت

پروفیسر صلاح الدین کے مضامین

﴿افکارِ تازہ.....اشاعتِ ثانی﴾

ا	پیش لفظ۔اشاعتِ اول	5
ب	پیش لفظ۔اشاعتِ ثانی	9
ت	مختصر سوانح .....پروفیسر سراج الدین	10
ث	پروفیسر صلاح الدین۔ایک تاثر.....پروفیسر سراج الدین	12

فہرستِ مضامین

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
۱۔	مطالعۂ قرآن	16
۲۔	سیرت پاکؐ کے چند پہلو	24
۳۔	رسول اکرمؐ کا پیام حیاتِ نو	28
۴۔	اسوۂ نبویؐ اور عصرِ جدید	34
۵۔	مذہب کی ماہیت	39
۶۔	مذہب کا صحیح تصور	45
۷۔	مذہب میں ظاہر و باطن کا فرق اور ان کا باہمی تعلق	49

۸۔	اسلام کی اساسی تعلیم	54
۹۔	اسلام میں عبادت کا تصور	61
۱۰۔	اسلام۔دین ثقافت	66
۱۱۔	اسلامی انقلاب	70
۱۲۔	شک واعتقاد	73
۱۳۔	قرآن اور اقبالؔ	78
۱۴۔	اقبالؔ اور عصری تقاضے	89
۱۵۔	A note published in the journal "Islamic Culture" (1978-1979)	96
۱۶۔	Osmania University Diamond Jubilee Celebration (1978-79)..... CITATION	99
۱۷۔	اقبال اکیڈیمی..... خبرنامہ	100

❁❁❁

پیش لفظ۔ اشاعتِ اوّل

پروفیسر صلاح الدین مرحوم کے مضامین ترتیب اور اشاعت کی سعادت میرے حصّہ میں آئی یہ میری خوش نصیبی ہے۔ موصوف اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد کے فاؤنڈر ممبرس میں سے تھے اور یہ بات اکیڈیمی کے لئے باعث افتخار ہے کہ اکیڈیمی کے وقار اور اس کے علمی معیار کو بلند کرنے میں پروفیسر صلاح الدین کی شخصیت کا نمایاں حصّہ رہا ہے۔

موصوف سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء کے اوائل میں ہوئی جب کہ نوجوانوں اور طلباء کے ایک مختصر سے گروپ کو انہوں نے مسجد قطب شاہی بازار گارڈس میں مخاطب کیا تھا۔ پہلی بار ان کے علمی تبحر، دلکش انداز بیان اور فکر کی ندرت اور تازگی کا جو نقش دل پر بیٹھا وہ نجتہ تر ہوتا گیا۔ اس کے بعد اسٹیڈی سرکل کل ہند مجلس تعمیر ملّت کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تعارف اسلام کلاسس اور اجتماعات میں ان کے عالمانہ خیالات سے استفادہ کے لئے انہیں زحمت دی جاتی رہی۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے متعدد اجتماعات میں انہوں نے توسیعی لکچرس دیئے۔ ابتداء میں ان کی گوشہ نشینی کا رجحان اور انکسار آڑے آیا، لیکن اصرار کے بعد وہ آمادہ ہو گئے۔ یہ ہماری خوش بختی تھی، جب بھی کسی علمی محفل سے خطاب کرنے کے لئے ان کو زحمت دی جاتی تو وہ پوری شفقت اور تواضع کے ساتھ تشریف لاتے۔ جب بھی مجھے ان کی یاد آتی ہے تو وہ منظر میری چشمِ تصور کے سامنے گھومنے لگتا ہے کہ صبح ۱۰ بجے میں آٹو رکشا لئے ہوئے ان کے مکان (آصف نگر) پر پہنچ جاتا وہ پانچ (۵) منٹ میں تیار ہو کر آجاتے۔ مدینہ مینشن تک ناہموار سڑک پر آٹو رکشا اُچھلتا کودتا رواں دواں ہوتا، وہ جھکولے کھاتے ہوئے سگریٹ سلگانے کی کوشش کرتے اور اس کوشش میں کئی دیا سلائیاں ضائع ہو جاتیں۔ کبھی کبھی میں رکشا کو رکوادیتا تا کہ وہ اطمینان سے سگریٹ سلگائیں چند منٹوں کی یہ رفاقت میرے لئے بڑی خوشگوار ہوتی اور میں اس دوران انکی شگفتہ بیانی اور

چست فقروں سے استفادہ کرتا رہتا۔ بارہا مجھے احساس ہوا کہ اس پیرانہ سالی میں ان کو زحمت دینا ان پر زیادتی ہے۔ لیکن ان کے چاہنے والوں کی یہ خواہش تھی کہ انکے علم وحکمت سے استفادہ کے جو بھی لمحات میسر آسکیں وہ ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ان کی غیر معمولی شفقت، مروت اور خوش اخلاقی ہمارا حوصلہ بڑھاتی رہی کل ہند مجلس تعمیر ملت اور اقبال اکیڈیمی کے کاموں کی وہ ستائش کرتے اور خصوصاً محترم جناب سید خلیل اللہ حسینی کی خدمات کے وہ قدرداں تھے۔

پروفیسر صلاح الدین مرحوم کی شخصیت مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اُفقی اور عمودی دونوں سمتوں میں ان کی فکر رسا نے ان کی شخصیت اور افکار میں جو حسن اور توازن پیدا کر دیا تھا اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی سامنے آتی ہیں۔ وہ بہت ہی بلند پایہ مفکر اور عالم تھے۔ اقبال کا یہ شعر ان کی زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

خردافزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

اسلام مشرق علوم، فارسی ادبیات پر گہری نظر اور خصوصاً رومیؔ اور حافظؔ کے مطالعے نے انہیں بصیرت اور نظر عطا کی۔ اور مغربی علوم خصوصاً فلسفہ اور نفسیات کے تو وہ ماہر تھے ہی، لیکن ان عناصر نے انہیں ایک روشن فکر اور تجزیاتی ذہن کا حامل بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں اور تقاریر میں کوئی الجھاؤ نہیں ہوتا بلکہ بڑی وضاحت اور سلاست ہوتی۔ فلسفہ وحکمت کے غیر معمولی اور ادق مسائل بھی وہ اس انداز سے پیش فرماتے کہ سامعین کے قلب وذہن میں اُتر جائیں۔ ہزاروں اشعار ان کے حافظہ میں محفوظ تھے۔ دورانِ تقریر ان کا استعمال موضوع میں ایک جان سی ڈال دیتا۔ اگرچہ سادگی اور انکساری ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی لیکن وہ ایک مرد خود آگاہ وخود آشنا تھے۔ وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی کے اعتبار سے وہ ایک بڑے اسکالر اور دانشور تھے۔ غرض ان کی دلنواز شخصیت اور ان کا علمی ذوق وتبحرّ ہمارے لئے ایک منارۂ نور تھا۔

زیر نظر کتاب ان چند مقالات کا مجموعہ ہے جو دستیاب ہو سکے۔ جب بھی وہ کوئی مضمون پڑھتے تو میں اس کی نقل حاصل کر لیتا۔ بسا اوقات میں اصرار سے اصل مسودہ ہی حاصل کر لیتا۔ بس

اب یہی سوغات اہل علم کی خدمت میں پیش ہے۔ اس مختصر سے مجموعے ہی سے ہم ان کی فکر رسا کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

زیر مطالعہ مقالات، قرآن مجید، سیرتِ طیبہؐ، اسلام کے مختلف پہلوؤں اور اقبالیات سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان بلند پایہ مقالات کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کروں گا اور نہ میں اس کا اہل ہوں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان کی مذہبی بصیرت نے انہیں جو نظر بخشی وہ دین اسلام کی ابدی روح اور بدلتے ہوئے زمانہ میں ان کے مختلف اظہارات کے درمیان نازک فرق کو دیکھ سکتی تھی۔ اُصول وفروع میں امتیاز، اساس اور اس کے لواحق وزوائد میں فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذہب کے حرکی اور تخلیقی پہلو پر زور روحِ عصر کی عکاسی ان مضامین میں قدرِ مشترک ہے۔ یہ مضامین ہمیں مذہب کے بارے میں ایک نئے اندازِ فکر سے سوچنے پر مائل کرتے ہیں، بجائے خود یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

پروفیسر صلاح الدین کے سانحۂ ارتحال پُر ملال کے بعد ان کے ارکانِ خاندان نے مرحوم کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اقبال اکیڈیمی پر اپنی نوازشات کے سلسلہ کو جاری رکھا چنانچہ بیگم صاحبہ پروفیسر صلاح الدین نے مرحوم کے کتب خانہ کی دو ہزار سات سو سے زائد کتابیں مرحمت فرمائیں۔ ان کے صاحبزادوں کے علاوہ دیگر افرادِ خاندان کی عنایات ہمارے لئے حوصلہ افزاء رہی ہیں۔

پروفیسر صلاح الدین کے بھانجے پروفیسر سراج الدین مجلس علمیہ اقبال اکیڈیمی کے صدر تھے، ان کی سرپرستی اور علمی رہنمائی اقبال اکیڈیمی کو حاصل رہی۔ میری گزارش پر انہوں نے پروفیسر صلاح الدین کے بارے میں ایک تاثراتی خاکہ اور مختصر سوانح تحریر فرمائی تھی جو پروفیسر صاحب کی شخصیت کی عمدہ عکاسی ہے۔

محمد ظہیر الدین احمد

صدر اقبال اکیڈیمی

پیش لفظ۔ اشاعتِ ثانی

پروفیسر صلاح الدین سابق صدر شعبہ فلسفہ کے مقالات کی دوسری بار اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ پہلے ایڈیشن کی تقریباً تمام کاپیاں اہل علم و دانش کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں۔ یہ مضامین اپنے انوکھے اندازِ فکر کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ دور حاضر میں اسلام کی دلنشین ترجمانی جس خوبصورت انداز سے پروفیسر صاحب نے کی ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ اور تخلیقی فکر کا عکس ہے۔

۱۹۷۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈائمنڈ جوبلی تقاریب کے موقع پر پروفیسر صلاح الدین کے بارے میں جو تعارفی اور تہنیتی نوٹ 'Citation' شائع ہوا تھا وہ بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ معیار کے حامل جرنل اسلامک کلچر میں مطبوعہ موصوف کی ایک عالمانہ تحریر بھی شامل کی گئی ہے جو آج بھی غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے۔

اقبال اکیڈیمی اس کتاب کی دوبارہ اشاعت پر بڑی مسرت محسوس کرتی ہے۔

۲۱/اپریل ۲۰۱۵ء

محمد ظہیر الدین احمد
صدر اقبال اکیڈیمی

پروفیسر صلاح الدین

۱۹۸۱ء۔۱۸۹۹ء

از : پروفیسر سراج الدین

مختصر سوانح

پروفیسر محمدؐ صلاح الدین ۱۸۹۹ء میں عثمان آباد میں پیدا ہوئے جو مرحوم ریاست حیدرآباد کے مغربی ضلع عثمان آباد کا مستقر تھا۔ اس وقت ان کے والد مولوی وحید الدین ضلع کی دوم تعلقداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولوی محمدؐ وحید الدین ریاست حیدرآباد کے پہلے سیولین بیاچ سے تعلق رکھتے تھے' جو بعد میں ضلع صرفخاص کے اول تعلقدار بنے اور وحید جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ پروفیسر صلاح الدین کی ابتدائی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق خانگی اساتذہ کے سپرد رہی۔ بعد میں انھوں نے غالباً کچھ دن سٹی ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ مزید تعلیم کے سلسلہ میں وہ کچھ روز علی گڑھ میں رہے پھر جب جامعہ عثمانیہ قائم ہوا تو یہاں چلے آئے اور اسی جامعہ سے بی' اے کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کے پہلے بیاچ سے ان کا تعلق تھا۔ طلبائے جامعہ کی انجمن اتحاد کے پہلے صدر بھی جناب صلاح الدین ہی تھے۔

جب ۱۹۶۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی نے گولڈن جوبلی کے موقع پر اپنے ممتاز سابق طلباء کو اعزاز عطا کیا تو ان میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور پروفیسر صلاح الدین شامل تھے بی اے کے بعد ڈھاکہ گئے جہاں ڈھاکہ یونیورسٹی سے انھوں نے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ساری جامعہ میں اوّل رہے۔ طالب علمی کے دور میں ہر امتحان میں ان کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا۔ ان کے اس ممتاز تعلیمی رکارڈ کی بناء پر ریاست حیدرآباد نے انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ منظور کیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ انگلستان روانہ ہوئے اور سات سال آکسفورڈ اور لندن میں گزارے۔ ۱۹۳۱ء میں جب وہ حیدرآباد واپس ہوئے تو ابتداء میں ان کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ہوا۔ بعد میں وہ فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں بہ حیثیت صدر شعبہ فلسفہ یونیورسٹی کی خدمت سے وظیفہ پر علحدہ ہوئے۔

پروفیسر صلاح الدین اپنے عہد کے متبحر عالم تھے' اُن کا علم نہ صرف بہت گہرا بلکہ بے حد وسیع تھا' جس کا محیط فلسفہ اور نفسیات کے علاوہ اسلامی تصوف' مذہب اور ثقافت اور انگریزی' عربی' فارسی' اردو کی زبانوں اور ادب تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ شہر کے ان معدودے چند لوگوں میں تھے جو لاطینی زبان بھی جانتے تھے۔ فرانسیسی اور جرمن سے بھی وہ واقف تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف مترجم قرآن وصدر انڈو مڈل ایسٹ کلچرل سوسائٹی کی ایماء پر پروفیسر صلاح الدین نے علامہ سلیمان ندوی کی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جو سوسائٹی کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ صلاح الدین صاحب کا علمی شغف شہر میں مشہور تھا۔ ان کی ساری عمر کتابوں کے درمیان گزری' اُن کے ذاتی کتب خانہ میں چھ ہزار کتابیں تھیں۔ دکن کے ممتاز ترین فرزندوں میں پروفیسر صلاح الدین کا شمار ہوتا ہے۔ پروفیسر صلاح الدین کا انتقال ۳/مارچ ۱۹۸۱ء میں ہوا ۸۲ سال کی عمر پائی۔

❀❀❀

پروفیسر سراج الدین

پروفیسر صلاح الدین۔ایک تاثر

ا۔کسی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا دوصورتوں میں آسان ہے۔ایک صورت یہ ہے کہ مذکورہ فرد کا کوئی اہم کام ہو کچھ کھلے قابلِ ذکر کارنامے ہوں کہ انھوں نے فلاں کتابیں لکھیں فلاں فلاں خدمات پر مامور رہے' حسب ذیل اداروں کی صدارت یا معتمدی پر فائز رہے فلاں تحریک چلائی' فلاں کالج قائم کیا یا مجلس کی بناڈالی' ایسے لوگ بہت قابل قدر ہوتے ہیں کیوں کہ وہ انسانی زندگی یا ذہنی یا سماجی اسلوب میں ایک اضافہ کر جاتے ہیں۔یہہ ایسے لوگ میں جو جذبہ خدمت کے علاوہ آپ ایسی انا رکھتے ہیں جو نمواور منظر عام پر جلوہ گری کی متقاضی ہوتی ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ شخص موصوف میں کچھ ایسی صفتیں ہوں جنہیں میں صفات مقتداول کہوں گا۔جیسے یہ کہ یہ بڑے فیاض ہیں۔یارحم دل ہیں یا محنتی ہیں یا ہمدرد ہیں خوش اخلاق ہیں' خوش اطوار ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۲۔لیکن اگر آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں جس نے ایک جامع داخلیت کو اپنایا ایسے کاموں سے اجتناب کیا جو منظر عام پر آسکیں' اپنی ذات کے حصار اتنے اونچے کر لیئے کہ عام نظر میں صرف در ودیوار کے نقش دیکھ سکیں تو صورت حال بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔

۳۔صلاح الدین صاحب کے ساتھ کچھ یہی معاملہ درپیش ہے۔جن لوگوں نے انھیں دیکھا وہ زیادہ تر اس طرح کہ جیسا غالباً حسرتؔ نے کہیں اپنے بارے میں کہا ہے کہ ۔

حسرتؔ سے ملے لیکن حسرتؔ کو نہیں دیکھا

صلاح الدین صاحب میں جو صفات تشکیل پائیں تھیں وہ برسوں کی پرورش اور خاموش غیر مرئی ریاضِ علمی کا نتیجہ تھیں۔اور اس بناء پر اس قدر پیچیدہ تھیں کہ ان کو سیدھے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ویسے ان کی خوش اخلاقی وخوش اطواری بالکل عیاں وظاہر تھی لیکن اس کے پیچھے ذہنی سفر کی جو منزلیں اور پیچ در پیچ راہیں تھیں وہ ہمیشہ اوجھل رہیں۔اور خود میری معلومات ان کے بارے میں ناقص اور صرف ایک استنباطی قیاس پر مبنی ہیں۔ممکن ہے ان کے قریبی دوستوں کو ان کا کچھ علم ہو۔یا پھر

دوستوں سے ہٹ کر اس کا اندازہ کچھ ان کے شاگردوں کو ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں برسوں جو لکچر دیئے ان میں ضرور ان کے کچھ خدو خال ابھرے ہوں گے۔

۴۔ میں نے خود کوئی خاص کوشش ان سے قریب ہونے کی نہیں کی حالانکہ برسوں ساتھ اٹھا بیٹھا، گفتگو کی ان سے شعر سنے اور ان کو شعر سنائے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ غیر محسوس طریقے سے ان کی شخصیت میرے ذہن میں اترتی رہی اور آج میں اس شخصیت کو اپنے دل کے نہاں خانے میں اپنے عادتی وقار کے ساتھ متمکن دیکھ سکتا ہوں لیکن اس کی بعینہ عکاسی نہیں کر سکتا۔

۵۔ ایک بڑا گہرا ذہنی تکلف یا RETICENCE ہمیشہ صلاح الدین صاحب کے مزاج کا جزو رہا۔ اس تکلف کی کنجی میں نے فرصت وفکر کے لمحوں میں ڈھونڈی ضرور ہے، لیکن پتہ نہیں اس کو انھوں نے کس طاق میں رکھ دیا تھا کہ ملی نہیں۔ یہ تکلف یا ذہنی ضبط یعنی RESTRAINT صلاح الدین صاحب کے کردار کا بنیادی نقطہ ہے۔ مجھے علم نہیں کہ یہ کب اور کس طرح ان کے مزاج کے جزو بنا تھا۔ کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ان میں یہہ بات نہیں تھی وہ اپنے عہد کے بہت عمدہ مقرر تھے۔ ڈھاکہ میں ایک فی البدیہہ تقریری مقابلے میں جس میں طلباء اور اساتذہ دونوں شریک تھے۔ انہوں نے سب کو شکست دے کر طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ کے پہلے صدر کی حیثیت سے انھوں نے جو تقریریں کیں وہ یادگار ہیں لیکن زندگی کی کسی منزل پر انھوں نے اس رکاؤ کو اپنا لیا جو آخر تک ان کے ساتھ رہا۔ کبھی کبھی کسی تقریر میں یہ بند ٹوٹ جاتا تو اس وقت اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے کیا سیلاب رکا ہوا ہے۔

یہاں میں تعمیر ملت اور اقبال اکیڈیمی کو یہ امتیاز دوں گا کہ انھوں نے ایک گوشہ نشین قلندر کو اس کے حجرے سے نکالا اور اس کی دبی ہوئی قوت فکر اور قوت اظہار کو بہہ نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب خلیل اللہ حسینی صاحب اور ارباب اکیڈیمی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ان کی آخری عمر ہی میں سہی صلاح الدین صاحب کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی فکر انگیز اور پر وقار آواز شہر کے مہذب لوگوں تک پہنچا سکیں۔

۶۔ میرا خیال ہے کہ صلاح الدین صاحب کی شخصیت کا مرکزی سوال یہ ہے کہ انھوں نے کیوں ساری عمر اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ کبھی کبھی ہم کو یہ خیال ہوتا تھا کہ ان کی قوت تخلیق آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی ہے۔ یہ بات اب صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جب اقبال اکیڈیمی میں

انھوں نے کہنا شروع کیا تو سب کو یہ احساس ہوا کہ پیرانہ سالی میں بھی ان کی فکر توانا اور جاندار ہے مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھر کے جلسوں میں وہ کبھی کبھی مذاق مذاق میں جو چیز لکھ جاتے اس میں بھی بڑی گہرائی اور بلند خیالی ہوتی۔ ایک دفعہ انھوں نے بعض دوستوں کے کہنے پر ایک کتاب ''نشتر'' پر ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا۔ یہ فارسی میں لکھا ہوا ایک بڑا ہی پرسوز افسانہ 'عشق ہے۔ جسے گلبرگہ میں مقیم کسی منشی سجاد حسین کسمنڈیوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس مضمون کو میرے منجھلے ماموں جلال الدین اشک' باقی صاحب' معین الدین قریشی صاحب' رئیس صاحب' بدر شکیب صاحب وغیرہ نے دیکھا اور ان سب کا خیال یہ تھا کہ اردو میں ایسی تحریر و تنقید مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ لیکن پھر اس کے بعد کبھی کسی سے انھوں نے یہہ بھی کہا تھا کہ نفسیات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی ان کے ذہن کے صفحوں ہی میں رہ گئی۔

۷۔ اس بات کی کئی توجیہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ صلاح الدین صاحب نے اپنی عمر ایک ایسے سماج میں گزاری جو بنیادی طور پر غیر تخلیقی تھا۔ حیدرآباد نے بڑے عمدہ ذہن پیدا کئے لیکن انھیں فعال بنانے میں کوئی مدد نہیں کی۔ ممکن ہے یہاں کا جاگیرداری نظام اس کا ذمہ دار ہو یا وہ عافیت و آسودگی جو یہاں کے طبقہ شرفاء کو حاصل تھی۔ ہندوستان کی بڑی بڑی تحریکیں حیدرآباد کے بازو سے ہوکر نکل جاتیں اور یہ جزیرہ اپنی پُرسکون فضاء میں ان سب سے بے نیاز رہتا۔ اس بے تموج ٹھیراؤ کا اور کئی شخصیتیں شکار ہوئیں۔

ایک اور وجہ ہوسکتی ہے کہ صلاح الدین صاحب صرف اعلیٰ ترین تخلیق ہی کے قائل تھے۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ ہاں کوئی ایسی چیز ہو جو عالمی سطح پر جانچی جاسکے تو پھر اس پر توجہ کرنا مستحب ہے ورنہ تضیع اوقات۔ انھوں نے یہ فراموش کردیا کہ کوئی شخص اپنی پہلی ہی تخلیق اس معیار کی نہیں پیش کرسکتا بہرحال ان پر وہ بات صادق آتی ہے۔ جو آرنلڈ نے گرے (GRAY) کے بارے میں لکھی تھی کہ۔

GRAY NEVER SPOKE OUT

۸۔ صلاح الدین صاحب کا ذہن قسم اول کا ذہن تھا۔ جن لوگوں نے کبھی کبھی اس ذہن کی جھلکیاں دیکھی ہیں انھیں اندازہ ہے کہ وہ کس درجہ کا تھا۔ بعد میں انھوں نے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ علم کو اپنے اندر اتارتے جائیں۔ ان کا ذہن ایسا تھا جو علم کو مسلسل جذب کرتا جاتا تھا۔ بہت کم ایسے قدح خوار

ہوتے ہیں کہ خم کے خم لنڈھا دیں اور قدم اور ذہن میں ذرا سی لغزش نہ آئے۔ صلاح الدین صاحب ایسے ہی لوگوں میں ایک تھے‘ان کے ظرف نے انھیں ہمیشہ سنبھالے رکھا۔

۹۔ میرا کچھ ایسا احساس ہے کہ وہ مسلسل اپنے آپ کی تخلیق میں مصروف رہے۔ ان کے لئے خود اپنی اور اپنے ذہن کی تہذیب ایک تخلیق کے مماثل تھی۔ اس لحاظ سے ہمارے لئے (کم از کم ان لوگوں کے لئے جو ان کو اچھی طرح جانتے ہیں) صلاح الدین کا سب بڑا تحفہ خود صلاح الدین تھے‘ایک ایسی شخصیت جس میں مشرق و مغرب کی تہذیب کے بہترین عناصر آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئے تھے۔

۱۰۔ صلاح الدین صاحب نے سات سال انگلستان اور یورپ میں گزارے تھے۔ وہاں کے بائیں بازو کی تحریکوں میں حصہ لیا تھا۔ آکسفورڈ میں فلسفے کے درس سنے تھے۔ انگلستان میں ان کے ہم عصر سجاد ظہیر‘ علی یاور جنگ‘ ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے لوگ تھے۔ آکسفورڈ سے انھوں نے کوئی ڈگری نہیں لی‘ لیکن جب انگلستان سے لوٹے تو ایک پورا کتب خانہ ان کے ساتھ تھا۔ کتابیں اور حقہ ان سے آخر تک نہیں چھوٹے۔ صلاح الدین صاحب کی شخصیت کی حرکت ایک شدید انفرادیت سے جماعت کی طرف رہی ہے۔ میں نے انھیں سے پہلی بار یہ مصرعہ سنا تھا کہ

ہم رنگِ جماعت شد تا لذّتِ جاں بینی

شک و الحاد کی منزلوں سے وہ گزر چکے تھے اور آخر عمر میں ان کی طبیعت میں یقین کا اطمینان اور سکون آ گیا تھا۔

صلاح الدین صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اور مجھے لکھنا بھی چاہیئے تھا لیکن فی الحال وقت نہیں اور ظہیر صاحب کا اصرار ہے کہ جو بھی ہو جائے ان کے حوالے کیا جائے۔ لہذا یہ چھوٹا سا خاکہ رواروی میں لکھا گیا ہے۔

❁❁❁

مطالعۂ قرآن

قرآن مجید مسلمانوں کا گراں بہا اور عزیز ترین اثاثہ ہے۔ مِلّت اسلامیہ کی عینیت، وحدت اور بقاء کا انحصار کلیتًا اِسی کتاب مقدس سے وابستگی پر ہے۔ جب تک مسلمان اس حبل المتین کو تھامے ہوئے رہیں گے نہ صرف وہ باقی رہیں گے بلکہ ان کی ذہنی توانائی اور روحانی شگفتگی بھی برقرار رہے گی۔ قرآن پاک نے ابتدائی مسلمانوں میں جو روح پھونکی تھی اسی کی بدولت ذہنی اور عملی میدانوں میں انھوں نے شاندار کارنامے انجام دیئے۔ اور سطح ارض پر سیلِ رواں کی طرح پھیل گئے۔ کچھ عرصہ سے مسلم اقوام پر حالت جمود طاری ہے۔ اور کہیں حرکت ہے بھی تو مائل بہ پستی۔ اِن دل شکن حالات میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کی صحیح تعبیر اور اس کے صحیح استعمال سے قاصر ہیں اس لئے ہمیں اس مسئلہ پر از سر نو غور کرنا چاہیئے کہ قرآن کے مطالعہ میں کس مقصد اور کس نقطۂ نظر کو پیش نظر اور کن شرائط کو ملحوظ رکھیں تا کہ اس کی تعلیم کو بخوبی سمجھ سکیں اور اِس کے روح پرور عناصر کو قلب میں جذب کر سکیں۔

قرآن کے تعلق سے اولاً اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اسے اس معیار سے نہیں جانچا جا سکتا جس کا اطلاق عام کتابوں پر ہوتا ہے۔ کسی کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہم اس بناء پر کرتے ہیں کہ وہ کس درجہ کی معلومات بہم پہنچاتی اور انھیں کس وضاحت سے پیش کرتی ہے کہ ذہن کے لئے بلا تاخیر اور بلا وقت قابل قبول ہوں۔ ادبِ لطیف کی صورت میں ہمارا سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ کس نوع کی خوشگوار جذباتی ہیجان پیدا کرتی اور کون سے لطیف حِسیات خفتہ کو بیدار کرتی ہے۔ ان دونوں صفاتِ اطلاعی اور برانگیزی میں نہ صرف امتیاز کیا جاتا ہے بلکہ انھیں ایک دوسرے سے بالکل الگ اور ایک دوسرے میں مداخلت سے باز رکھا جاتا ہے۔ معلومات رساں کتب میں جذبات کی مداخلت نامناسب اور نازیبا سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر شاعر اپنے کلام کو متاثر کرنے کے لئے کام میں لانے کے بجائے مطلع کرنے کا ذریعہ بنائے تو اس کا کلام نہ صرف ناگوار گزرے گا بلکہ وہ ادبی قدر بھی کھو بیٹھے گا۔ عام علمی اور ادبی کتب کے برخلاف قرآن میں ان دو صفات کی ایسی گہری اور لطیف

آمیزش پائی جاتی ہے کہ دونوں ایک واحد حقیقت کے ابعاد (DIMENSIONS) نظر آتے ہیں۔

اطلاعی بُعد انسان کے آغاز وانجام کے منتہائی حقایق کا احساس پیدا کرتا اور ان سے آگہی کی سمت رہبری کرتا ہے۔ اور برانگیزی بُعد سرچشمہ کائنات سے قربت ربط اور اتصال کی فطری تمنا کو جو قلب انسانی کے رگ وریشہ میں پیوست ہے متحرک کرتا اور تشفی کی جھلک سے اسے سُحور اور مسرور کرتا ہے۔ انسان کا نصب العین تو یہی ہونا چاہیئے کہ قرآن کے دونوں پہلوؤں سے مستفیض اور مستیز ہو۔ لیکن کوئی ایک پہلو بھی روحانی ارتفاع کے لئے کافی ووافی ہے۔ قرآن کی اس دوگونہ خصوصیت کو پیش نظر رکھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے قرآن کے معانی اور مطالب پر دسترس نہیں رکھتے وہ بھی اس کی تلاوت سے روحانی فیضان حاصل کر سکتے ہیں۔ تلاوتِ قرآن فہم ودانستگی کے ساتھ ہو یا ان کے بغیر ہر صورت میں دینی جذبہ اور روحانی کیف کی پرورش اور نشو ونما کا موثر ذریعہ ہے۔ قرآن سے مستفیض ہونے میں فہم ودانش سے زیادہ حقیقتِ منتہائی سے ربط اور قربت کی تمنا زیادہ کارگر اور ثمر آور ہوتی ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن سے مکمل استفادہ کے لئے اس تمنا کے ساتھ فہم ودانش کا اشتراک ناگزیر ہے۔

مطالعہ قرآن کی دوسری منزل پر ہمارا مقصد اس کے مطالب کو صحیح طور پر سمجھنے، مرکزی تعلیم سے ان کے تعلق اور ان کی اضافی قدر و قیمت کے تعین کی پیہم کوشش ہونا چاہیئے۔ اس راہ پر قرآن کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے احتیاط سے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن لغزشِ گام کا خوف اتنا غالب نہ ہو کہ فکر آزادی عمل سے محروم ہو جائے۔ [1]

ایک مثال [2] سے واضح ہوگا کہ قرآن کے مختلف حصّوں کی اضافی قدر و قیمت کا سوال کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ حیدرآباد ریڈیو سے قرأت اور تفسیر کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ مولوی صاحب نے پروگرام کے لئے ہدہد اور سلیمانؑ کے قصّہ کا انتخاب کیا تھا۔ انھوں نے قرأت سے ابتداء کی اور پھر ان آیات کی تفسیر بہت خوبی سے بیان کی۔ سامعین متاثر ہوئے لیکن قدرتی طور پر ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن کی مرکزی تعلیم سے اس قصّہ کا کیا تعلق ہے اور قرآنی نظام افکار میں اس کا کیا مقام ہے وہ متن میں شامل ہے یا حواشی میں۔ فرض کیجئے کہ کوئی حسین تصویر ہے، ظاہر ہے کہ وہ کسی فریم میں ہوگی اور وہ بھی اس کی مناسبت، سے نفیس اور بیش قیمت ہوگا لیکن مبصّر اس کو اپنی نظر سے ہی دیکھے گا اور اس کی توجہ اصل تصویر پر مرتکز رہے گی۔

۱۔ آنکہ ہر گام بلغزید دریں کوئے برفت، ۲۔ صفت راہرو لغزشِ گام است اینجا

قرآن کا ہر کلیدی تصور بھی کوئی نہ کوئی فریم رکھتا ہے۔ یہ فریم عرب کی قومی روایات سے تشکیل دیا گیا ہے ۔اور اُس زمانے کی ذہنی فضاء سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ بھی ہمارے مطالعہ کا اہم موضوع ہے۔ لیکن فریم پھر بھی فریم ہے اور اسے پس منظر میں ہی رہنا چاہیئے ۔فریم دو طرح سے تصویر کی خدمت کرتا ہے۔ ایک تو اس کی حفاظت دوسرے اسے نمایاں کرنا۔ روایات اور قصص پر ہمیں اس نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیئے کہ وہ یہ دوگونہ فریضہ کس طرح انجام دیتے ہیں ۔ بہر حال مرکزی شکل اور اس کے چوکھٹے میں امتیاز معنی رسی میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے۔

مولانا روم نے جب کہا

مازقراں مغز را برداشتیم استخواں پیشِ سگاں انداختیم

وہ اسی فرق کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

اب اس سوال کو لیجئے کہ قرآن کا خطاب کس سے ہے۔ حال میں میرے ایک دوست انجینئر صاحب نے ذاتی تجربہ بیان کیا جو اس سوال سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے ایک غیر مسلم دوست نے کہا کہ وہ قرآن پڑھنا چاہتے ہیں اور استدعا کی کہ انھیں کوئی انگریزی ترجمہ دیا جائے انجینئر صاحب نے انھیں ایک ترجمہ دیا اور معاوضہ یہی طلب کیا کہ پڑھنے کے بعد وہ اپنا تاثر بلا تکلف بیان کریں۔ پڑھنے کے بعد جب وہ کتاب واپس کرنے آئے تو اس بارے میں ان سے سوال کیا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ بس میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب نے تو انسان کو سیدھا خدا کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا ہے ۔قرآن سے پہلی شناسائی میں یہ غیر مسلم جس طرح متاثر ہوا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کا خطاب انسان سے ہے' اور ہر انسان جو کہ عالم ہو یا جاہل' دانشور ہو یا اوسط ذہانت کا حامل ۔ پیغمبر سے بھی خطاب ہے تو ان کی انسانی حیثیت کے لحاظ سے۔ اسی لئے ہر انسان قرآن کی کشش محسوس کرتا اور اس سے مستفیض ہونیکی صلاحیت رکھتا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے جو مذاہب تھے ان میں پروہتی طبقہ خدا اور بندے کے درمیان واسطہ کا مدعی اور دونوں کے مابین حائل تھا۔ انسان خدا سے براہِ راست رجوع ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور پروہتوں کے توسط کا محتاج تھا۔ قرآن نے خدا سے انسان کا راست تعلق قائم کیا اور اسے خدا کے حضور میں لا کر کھڑا کر دیا۔ مطالعۂ قرآن اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہی سودمند ہو سکتا ہے کہ انسان سامع خطاب یزدانی ہے۔ پروہتوں اور ان افراد سے جن کے لئے مذہب ذریعہ معاش ہے نجات دلا کر قرآن نے انسان پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے ذہن و

روح کو وہ آزادی حاصل ہوئی جس کے لئے وہ صدیوں سے تڑپ رہا تھا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر قرآنی مطالب کو عام انسانوں کی ذہنی سطح پر پیش کیا گیا ہے اور مجرّد اور مافوق الفطرت حقائق کو ان تشبیہات سے جو مادی ماحول سے ماخوذ ہیں عام انسان کی ذہنی دسترس میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طریقہ کار میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ ان حقائق کا رشتہ مادی تشبیہات سے لاینفک ہو جائے۔ اور کائنات کی بالاتر سطحوں کا احساس اور ان کی تمنا قلب انسانی میں کمزور پڑ جائے اس خطرہ کی روک تھام کے لئے قرآن نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک ہی حقیقت کو مختلف سطحوں پر پیش کیا کہ انسان کی ذہنی ترقی کے ساتھ اس کے ذہن میں اس حقیقت کے تصور میں بھی اسی مناسبت سے رفعت وثروت میں اضافہ ہوتا جائے اور اس حقیقت کا تصور پست و بلند دونوں مدارج ذہنی کے انسانوں کے لئے بامعنی اور تشفی بخش ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مجرّد اور برتر حقائق کو مختلف سطحوں پر پیش کیا گیا ہے۔ مطالعہ قرآن سے بہرہ مند ہونے کے لئے قرآن کی اس خصوصیت اور اس کے پسِ پشت محرک کو ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس نکتہ کی توضیح کے لئے ایک مثال کافی ہے قرآن میں سزا اور جزا پر بہت زور دیا گیا ہے۔ انسان اس جہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے بھلے یا برے اعمال کے اثرات ساتھ لیتا جائے گا۔ اور یہی اثرات اس کے اخروی عالم کی نوعیت کا تعین کریں گے۔ جنت وہ عالم ہے جو اعمال صالح کا انجام ہے۔ اس کی تصویر لازماً ان رنگوں سے کھینچی گئی ہے جو مادّی دنیا مہیا کرتی ہے۔ ورنہ وہ ہمارے لئے غیر مرئی اور غیر موجود ہوگی۔ اس کے باوجود جنت کا تصور قرآن ہی میں دو سطحوں پر پایا جاتا ہے۔ نچلی سطح پر ایسا تصور ہے جو ہر انسان کے ذہن میں آسکتا ہے اور ہر انسان اس کی قدر کر سکتا ہے "**فیھما فاکھة و نخل و رمّان**" بلند سطح پر جو تصور پیش کیا گیا ہے ان لوگوں کے لئے ہے جو حظِ ذہنی کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کے قدر شناس ہیں۔ **دعْوٰھُم فِیھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ تَحِیَّتُھُم فِیھَا سَلام . و آخر دَعوٰھُمْ عَنِ الحَمْد للّٰہِ رَبّ العٰالَمِیْنَ۔**

(ترجمہ: جو انسان اس عالم میں رسائی حاصل کریں گے اس کی حسن و خوبی اور دلکشی سے اتنے متاثر ہوں گے کہ صرف ندائیہ کلمات سے اپنی ممنونیت کا اظہار کریں گے۔ اور پھر وہاں کے دوسرے ساکنین سے ان کے تعلقات' خلوص ومحبت' رافت و مودّت کے ہوں گے اور ہر ایک دوسرے کے لئے امن وسلامتی' مسرت وطمانیت کا متمنی ہوگا۔ اور آخر میں اس نعمت عظیم کے لئے بارگاہِ ایزدی میں جذباتِ تشکر و امتنان کی نذر پیش کرتے رہیں گے)۔ بہر حال مطالعہ قرآن کی پہلی منزل میں ہی

ہمیں اس سوال کا سامنا کرنا چاہئیے کہ کس حقیقت کو کس سطح پر پیش کیا گیا ہے۔

مطالعۂ قرآن کی ایک لازمی شرط قرآن کی ابتدائی آیات ہی میں بیان کر دی گئی ہے کہ اس کتاب سے وہی ہدایت حاصل کر سکتا ہے جو غیب پر ایمان و ایقان رکھتا ہو۔ قرآن میں غیب کا تصور محض منفی نہیں ہے اور یہ لفظ عدم وجود کا مرادف نہیں۔ غیب کا قرآنی تصور مثبت اور ذی ثروت ہے۔ وہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وجود لامحدود سطحوں پر مشتمل ہے ہم اپنی ناقص عقل اور محدود ذہنی وسائل سے صرف اس کی ایک دو سطحوں سے ربط قائم کر سکتے ہیں۔ کسی شئے کو سمجھنے کے لئے پہلا قدم اس کے وجود پر یقین ہے۔ وجود کی بالائی سطحوں کی سمت صعود اُسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمیں ان کی حقیقت کا یقین ہو۔

اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سائنس کی ترقی نے کائنات کے وہ پہلو ہم پر آشکار کر دئے ہیں جو ہمارے تخیل کی سرحد سے ہی پرے تھے۔ علم و تجربہ کی ترقی کے ساتھ عجب نہیں کہ کائنات کے بلند تر اور لطیف تر پہلوؤں سے ہمارا ربط قائم ہونے لگے۔ علم و تجربہ کی موجود سطح پر ان بالائی سطحوں کا ہم تصور نہیں کر سکتے تشبیہہ و استعارہ کی مدد سے ہم اپنے ذہن کو ان کی سمت متوجہ کر سکتے ہیں۔ قرآن میں تشبیہہ و استعارہ کی زبان ہی ان حقائق کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ ان آیات قرآنی کا مطالعہ دو تین شرائط کے تحت ہی سود مند ہو سکتا ہے۔ پہلے تو ہم ان حقائق کو سمجھنے میں اپنی بے بسی کا کھلے دل سے اعتراف کریں۔ دوسرے اس امر کو فراموش نہ کریں کہ تشبیہات ہمیں بہت تھوڑی دور ہی لے جا سکتی ہیں اس سے آگے انھیں لے جانے کی کوشش نہ کریں۔ تیسرے ان تشبیہات کی مدد سے متعلقہ حقیقت کا جو تصور بھی ہمارے ذہن میں قائم ہوگا یقیناً اس میں وسیع رخنے ہوں گے۔ ہم کبھی ان رخنوں کو اپنے تخیل سے پُر کرنے کی جسارت نہ کریں۔ اگر ہم ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھیں تو قرآنی تشبیہات پر غور و فکر سود مند ہو سکتی ہے۔ اس سے وہ حقیقت ہماری ذہنی گرفت میں نہیں آئے گی۔ مگر اس کا کم و بیش مبہم احساس شعور میں سرایت کرے گا۔ اور عالم بالا سے نیم شعوری یا غیر شعوری ربط سے وہ کیفیت جذبی پیدا ہو سکتی ہے جس کی قدر کا ثبوت اس میں مضمر ہے۔

مطالعہ قرآن میں ہم کو قرآن کے غیر مسلم نقادوں کی تصانیف سے بھی مدد مل سکتی ہے ان کے اعتراضات کی روشنی میں قرآن پر غور و فکر سے اس کی معنوی وسعت اور عمق کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں کہ ان کی مدد سے ہم قرآن پر نئے زاویہ سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ اور اس طرح اس کے مزید مضمرات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کے لئے ہی صرف ایک مثال پر اکتفا

کرتا ہوں حال میں ایک عیسائی عالم CRAGG کی تصنیف THE EVENT OF THE QURAN شائع ہوئی ہے اس کتاب پر ڈاکٹر وحید الدین کا قابل قدر تبصرہ اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے۔

کریگ نے قرآن کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔اور دیانتداری سے اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس وقت ہم صرف قرآن کے تصور صبر پر اس کی تنقید کو پیش نظر رکھیں گے۔ ہر مسلمان اس سے واقف ہے کہ قرآن میں صبر کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور انسان کو تاکید کی گئی ہے کہ ہر مصیبت اور ناکامی اور زندگی کی ہر تلخی اور ہر کٹھن منزل پر صبر کو شعار بنائے اور اس پر قائم رہے۔کریگ کی رائے میں یہ صبر کامل کا تصور نہیں ہے۔کیونکہ اس کا لازمی جز امید ہے یہ امید کہ مصیبت و ناکامی عارضی ہیں اور دیر سے سہی مگر بالآخر مصیبت مبدّل بہ راحت اور ناکامی مبدّل بہ کامیابی ہو جائے گی۔کریگ کہتا ہے کہ بلند ترین درجہ کا صبر وہ ہے جو امید کی آخری چنگاری کے بجھ جانے کے بعد رونما ہو۔اگر انسان نراش کی گہری تاریکی میں گھر جائے اور مستقبل کی طرف سے قطعاً مایوس ہو جائے' کوئی شعاعِ امید اس کے دل کو سہارا نہ دے' اُسے شدت سے احساس ہو کہ اس کی مصیبت اس کا درد و غم نہ صرف برداشت کی حد سے باہر ہے' بلکہ لامتناہی اور دائمی بھی ہے تو ایسے انسان کا صبر حقیقی صبر ہے۔اگر وہ ایسے عظیم حزینہ میں بھی سرِ تسلیم خم رکھتا اور صبر کرتا ہے تو وہ حقیقی معنی میں صابر ہے۔کریگ کہتا ہے کہ قرآن میں ایسے لامحدود اور ہمہ گیر غم کی طرف اشارہ نہیں ملتا اور نہ وہ ایسے انسان کو پیش کرتا ہے جو کائناتی یاس کا شکار ہو اور جس کا قلب گہری تاریکی کے آہنی پنجہ میں گرفتار ہو۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں انسان کے لئے نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ ہر مصیبت و آفت میں دامن امید تھامے رہے۔اور تائید غیبی کا منتظر رہے۔

دورِ گردوں گر دو روزِ برمرادِ ما   دایماً یکساں نباشد حالِ دوران غم مخور
(حافظ)

حافظ ایک مسلمان کی طرح قطعی اور آخری حزنیہ سے پہلو بچا کر چلتا ہے۔

باصبا در چمن لالۂ سحری گفتم   کہ شہیداں اندریں ہمہ خونیں کفناں

کریگ کا اعتراض اس حد تک صحیح ہے کہ امید' قرآنی تصورِ صبر کا لاینفک جز ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ یہ خامی ہے جیسا کریگ سمجھتا ہے' یا خوبی ہے۔اور حزینہ کے تعلق سے صحیح نقطہ نظر وہی ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یہ سوال اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ قطعی جواب شاید ممکن نہ ہو لیکن بعض

متعلقہ امور پیش کیے جاسکتے ہیں۔ پہلے ہماری نظر اس امر پر پڑتی ہے کہ ایسے کائناتی پیمانہ کا درد والم اور ایسی یاس جو وسعت اور تاریکی میں بحر ظلمات و شبِ یلدا سے بڑھ جائے، اس دنیا میں بھی جو دارالمحن ہے، شاذ و نادر ہی ہیں۔ دوسرے ان کا مقابلہ وہی انسان کرسکتا ہے جس کی شخصیت غیر معمولی مضبوطی اور استحکام کی حامل ہو اور ایسے غیر معمولی انسان کے لئے کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ ایسے ہمت شکن حالات میں بھی دامنِ امید تھامے رہے۔

بہر حال کریگ کے صبر کامل کے مواقع انسان کی خوش قسمتی سے واقعی دنیا میں بہت کم پیش آسکتے ہیں۔ اتنے کم کہ عملی طور پر انھیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اور انسانوں کی اکثریت کے لئے قرآنی صبر کی قدر و قیمت اور افادیت باقی رہتی ہے۔ البتہ مجرد اور نظری سطح پر یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا بلند ترین صبر وہی ہے جس کی نمود یاسِ بے پایاں اور الم بے کنار کے متن میں ہو۔ اور اسی سے دو ضمنی سوال وابستہ ہیں اولاً کیا ایسا صبر انسان کے لئے ممکن العمل ہے اور ثانیاً کیا رشتۂ امید ہر حال میں صبر کی قدر و قیمت میں گھٹاؤ اور کمی کا باعث ہوتا ہے۔ اس بارے میں قرآن کا یہ موقف ہے کہ امید بھی ذاتی قدر کی حامل ہے اور صبر بھی۔ اور دو قدروں کے اجتماع کا نتیجہ اضافہ قدر ہونا چاہیئے نہ کہ قدر کی کاستگی۔ امید کو قرآن میں اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ امید کو جزو ایمان اور انقطاع امید کو مستلزم کفر قرار دیا گیا ہے۔

ایں درگہٗ ما درگہٗ نو میدی نیست　　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مطالعۂ قرآن اسی وقت سودمند ہوسکتا ہے کہ اس کا واحد مقصد قرآن کو سمجھنا ہو۔ اگر ہم قرآن کا مطالعہ اس غرض سے کریں کہ دوسروں سے بحث مباحثہ میں اس سے کام لیں اور اپنے موقف کی تائید میں اس سے دلائل حاصل کریں تو قرآن کی روشنی ہمارے قلب تک نہیں پہنچ سکے گی قرآن نے اس بارے میں واضح ہدایت دی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ آيٰتِ اللّٰهِ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ (سورہ مومن آیت ۶۹)

ترجمہ: ’’تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں کہاں سے وہ پھرائے جارہے ہیں۔‘‘

یہ امر بھی ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن کو سمجھنے میں لغت سے اتنی مدد نہیں مل سکتی جتنی قلبِ صادق، شوقِ بے تاب اور دل گداختہ سے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے　　　شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

قلب صادق کا ثبوت سعی پیہم سے ملتا ہے۔ معنی رسی کے لئے سخت جدو جہد ضروری ہے۔ خود قرآن کی ہدایت ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ.

ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔''

اگر ہم ایسے معنی تک پہنچ جائیں جو ہماری ذہنی تشفی کے لئے کافی ہے۔ تو بھی بلند تر اور لطیف تر معنی کی تلاش جاری رہنی چاہیئے ہر چند مطالعہ قرآن میں جس منزل تک ہم پہنچیں اسے آخری نہ سمجھیں۔ جس معنی تک ہمارے ذہن کی رسائی ہوتی ہے اس سے مستفید ہونے کا ہمیں حق ہے۔ لیکن اس پر اصرار کرنے کا حق نہیں' اس اصول کو نظر انداز کرنے کی بھاری قیمت ملّت اسلامیہ کو ادا کرنی پڑی۔ متعدد فرقے اس لئے پیدا ہوئے کہ ہر فرقہ کا سربراہ اپنے پسندیدہ معنی کو دوسروں پر مسلط کرنے پر مائل ہو گیا۔ اگر وہ اس انکسار کو ملحوظ رکھتا جو قرآن کے تعلق سے ضروری ہے تو اپنی رائے پیش کرتا مگر اسے مسلط کرنے کی جسارت نہ کرتا۔ اس کے نتیجہ میں سب کے تعاون سے قرآن کو سمجھنے میں پیش رفت ہوئی۔ مطالعہ قرآن ایک ایسا سفر ہے جس میں پیش رفت امید اور صبر دونوں کے دامن تھامے رہنے سے ہی ممکن ہے۔ جو باتیں ہماری سمجھ میں آئیں ان کے لئے ہم شکر گذار ہوں۔ اور جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ جذبۂ احترام کے ساتھ اس وقت کے منتظر رہیں کہ ان کے معنی ہم پر منکشف ہوں۔ ہمارا فرض صرف آرزو کو بیدار اور کوشش کو جاری رکھنا ہے۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانَ اِلَّامَا سَعیٰ

❁❁❁

سیرت پاکؐ کے چند پہلو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنا اور اپنی بساط کی حد تک اس کا تتبع کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ آپؐ نے انسانی زندگی کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا جو روحانی ارتقاء کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

آپ کی سیرت صدیوں سے بلند پایہ علماء اور مفکرین کا مرکز توجہ رہی ہے۔ اس موضوع پر ممتاز علماء کی تصانیف ہیں۔ ان پر اگرچہ عقیدت کا رنگ غالب ہے لیکن یہ سیرت پاکؐ کی حقیقت عظمت، بے لاگ علمی بحث میں بھی بے محل نظر نہیں آتی۔ مغربی مفکرین میں بھی چند ایک ایسے ہیں جنھوں نے مخاصمانہ تنقید سے دامن بچا کر قدر شناسی کے انداز میں سیرت نبویؐ پر تبصرہ کیا ہے۔ ان سب تصانیف کے مطالعہ سے ذہن پر عام تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ ایسی ارفع اور جامع شخصیت پر سیر حاصل تبصرہ کسی ایک مفکر یا مصنف کے بس کی بات نہیں۔ ہر مفکر یا مُصنف اپنے خاص نقطہ نظر سے آپؐ کی سیرت کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کرتا اور کسی ایک خصوصیت پر زور دیتا ہے یہ انتخاب جو اس کے ذاتی نقطہ نظر کے تابع ہوتا ہے اس کے تبصرہ کو ایک وحدت ضرور بخشتا ہے۔ لیکن وہ آپ کی سیرت کی جامعیت کا حق ادا کرنے سے صریحاً قاصر رہتا ہے۔

گلدستہ صفات: تحلیلی طریقہ ایک عام انسان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد نہیں دیتا۔ بلند شخصیت کے تعلق سے تو اس کی خامیاں بالکلیہ آشکار ہو جاتی ہیں۔ شخصیت صفات کا مجموعہ نہیں بلکہ گلدستہ ہے۔ اسی لئے کسی صفت کی کشش اور دلفریبی کا انحصار اس کی ذاتی خوبی سے زیادہ مرتب نظام میں اس کے مقام، اور دوسری صفات سے اس کے تعلقات پر ہوتا ہے۔ مثلاً بہادری۔ یہ صفت بذاتہٖ پسندیدہ ہے لیکن جب وہ کسی واقعی شخصیت کے متن میں پائی جائے تو اس کی دلکشی کم یا زیادہ یا بالکل غائب بھی ہو سکتی ہے۔ بہادری مروّت اور رحم دلی سے وابستہ ہو تو جتنی دل آویز ہوتی ہے، خود غرضی اور سنگ دلی کے ساتھ اتنی ہی مکروہ۔ غرض صفات پر فرداً فرداً غور کرنے سے شخصیت کی صحیح اور مکمل تصویر پیش کرنا ممکن نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مطالعہ میں اس احتیاط کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے کسی ایک خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے ممکنہ حد تک آپؐ کی سیرت میں اس کے مقام کو متعین کرنا اور دوسری خصوصیات سے اس کے روابط کو واضح کرنا چاہیئے۔

سطور ذیل میں سیرتؐ کی ایک دو خصوصیات کا ذکر کروں گا۔ یہ خصوصیات زمانہ حال کے لئے خاص دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہیں۔

امتیازات کا خاتمہ اور رواداری : آپؐ کی سیرت کا جو پہلو خاص طور پر طالب توجہ ہے وہ آپؐ کی وسعتِ نظر فراخ دلی اور بے مثال رواداری کا ہے۔ تنگ نظری سے آپ طبعاً متنفر تھے۔ قومی، نسلی، مذہبی ہر قسم کے تعصب سے آپ کا دل پاک تھا۔ آپؐ نے اسلام کا دروازہ تمام انسانوں کے لئے کھول دیا اور ملّت میں شرکت کی دعوت عام دے دی۔ آپؐ کے فیضان عام سے مسلم اور غیر مسلم یکساں طور پر فیض یاب ہوتے رہے۔ مخالفوں، غیر مسلم سے بھی نرمی، خوش اخلاقی اور تلطف سے گفتگو فرماتے ان کی باتوں کو صبر و تحمل سے سنتے اور ان کے نقطہ نظر کو سمجھتے، صداقت کی تلقین فرماتے مگر کسی طرح کا جبر نہ کرتے حجتہ الوداع کا خطبہ رواداری اور اخوت انسانی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں آپؐ نے عرب قوم کے جس سے خود آپ متعلق تھے اس دعویٰ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے کہ وہ دوسری اقوام پر برتری رکھتی ہے۔ انسانوں کے درمیان تمام امتیازات کو جو تاریخی اتفاقات کا نتیجہ تھے مگر مستقل اور فطری معلوم ہوتے تھے ختم کر دیا اور صرف ایک امتیاز باقی رکھا جس کی بنیاد تقویٰ اور عمل صالح پر ہے۔ آپ نے نہ صرف یہ تلقین کی کہ خدا کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں بلکہ اپنے عمل سے مساواتِ انسانی کا اعلیٰ مظاہرہ فرمایا۔ گنہگاروں اور فاسقوں سے آپ کا سلوک مروّت اور ہمدردی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے آپ کی نظر میں کافر صرف وہی تھا جو قولاً اور فعلاً خدا اور خیر سے انکار کرے اور شر کی حمایت میں سرگرم عمل رہے۔ غیر مسلموں میں جو نیک ہوتے تھے آپ ان کی قدر و منزلت فرماتے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ کسی عیسائی شہر کے نمائندے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے انھیں مسجد میں ٹھہرایا ان سے وہیں بات چیت کی اور جب مذہبی عبادت کو انجام دینے کی خواہش ظاہر کئے تو آپ نے انھیں مسجد میں اپنے طور طریق سے دعا و عبادت کی اجازت عطا فرمائی۔ دنیا کے بہت کم مذاہب ہیں جو اس وسیع رواداری کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔

زندگی کا ہر عمل عبادت : آپؐ کی تعلیمات اور سیرت کا ایک اور رخ طالب توجہ ہے اور وہ ہے

عبادت کے متعلق آپ کا خاص اندازِ نظر' تقریباً تمام مذاہب میں عبادت کی اصطلاح بہت تنگ اور محدود معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔اور اس سے مراد مقررہ اوقات پر معیّنہ قواعد کے مطابق بعض افعال کی انجام دہی کی جاتی ہے۔آپؐ نے عبادت کا ایک وسیع تر اور بلند تر تصور پیش فرمایا اس کی رو سے ہر فعل عبادت قرار دیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان کا رخ خدا کی طرف ہو اور اس کا شعور خدا سے معمور ہو' اس صورت میں انسان کی مرضی خدا کی مرضی کے تابع ہو جاتی ہے۔اور ہر عبادت کی عِلّت غائی یہی ہے۔اس تصور کو اختیار کرنے سے زندگی کے متعلق ہمارے نقطہ نظر میں بنیادی تبدیلی رونما ہوتی ہے اور ہم اس عام غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے کہ ہمارے معاملات' اعمال اور سرگرمیاں دو جداگانہ قسم کی ہیں ۔دینی اور دنیوی۔ذہن کا رُخ صحیح سمت میں ہو تو ہر عمل دینی ہے۔ساتھ ہی اگر وہ دنیوی اعتبار سے کار آمد ہے تو اس کی قدر گھٹ نہیں جاتی۔سماجی زندگی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔یہ تصور اس تصور کے قطعاً منافی ہے جس پر طبقہ واری سماج کی بنیاد ہے یعنی بعض کام جیسے مذہبی اور علمی قدرتاً بلند درجہ کے ہیں اور ان میں جو لوگ مشغول ہیں انھیں اعلیٰ درجہ حاصل ہونا چاہئیے اسی لئے پادریوں' پروہتوں' پجاریوں کو اقتدار اور سماجی برتری حاصل رہی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ مزدور کو سماج میں باعزت مقام دلایا محنت کو قدر و منزلت عطا کی آپ نے فرمایا' خدا کی عبادت کرنے کے کئی طریقے ہیں' اور ان میں بہترین' پاک کسبِ معیشت ہے'' کنز الحقائق'' یہ بھی فرمایا۔''سب میں پاک غذا وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے'' (بخاری)

قدر محنت : اسد الغابہ میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جنگ تبوک کے دوران سعید الانصاری آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپؐ نے ان سے مصافحہ کیا اور پوچھا کہ ان کے ہاتھ زخموں کے نشانات سے کیوں بھرے ہوئے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ خاندان کی پرورش کے لئے وہ ایک بھاری ہتوڑے اور موٹی سخت رسی سے کام کرتے ہیں۔ ہاتھ اس لئے زخمی ہو گئے ہیں۔آپؐ نے اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور فرمایا دوزخ (کی) آگ ان ہاتھوں کو کبھی چھو نہیں سکتی''۔

عزت نفس : آپؐ کی سیرت کا ایک اہم پہلو آپؐ کا مضبوط و مستحکم احساسِ خودداری و غیرت ہے' عرفیؔ نے اپنے نعتیہ قصیدہ کی ابتدا اسی کی توصیف سے کر کے اپنی نگاہِ نکتہ بین کا ثبوت دیا ہے۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لاونعم را

روح' انسان خدا کا گرانقدر عطیہ ہے اس پر واجب ہے کہ اپنے جوہر روح کی مناسب قدر و منزلت کرے اور اسے تذلیل سے محفوظ رکھے۔ دستِ سوال اور شکرِ گدایانہ دونوں نفس انسانی کی عظمت کے منافی ہیں ہر مصیبت میں اور ہر شدید احتیاج میں آنحضرتؐ نے صرف خدا سے رجوع کیا' نہ کسی سے مدد مانگی نہ کسی کی ہمدردی کے خواہاں ہوئے غربت و فلاکت میں اور حشمت و ثروت میں یکساں طور پر اپنی خودداری کو ملحوظ اور نفس انسانی کے وقار کو برقرار رکھا دوسروں کو بھی یہی تلقین کی اور بھیک مانگنے سے سخت منع کیا۔

تمہارے لئے یہ بہت بہتر ہے کہ محنت سے روزی حاصل کرو بجائے اس کے کہ قیامت کے دن چہرے پر گدائی کا داغ لئے ہوئے حاضر ہو۔ (کنزالحقائق)

ایک مرتبہ فرمایا ''بھیک مانگنے سے قیامت کے روز چہرہ پر دھبہ رہے گا یاد رکھو صرف تین لوگوں کو بھیک مانگنے کی اجازت ہے (پہلا جو سخت فلاکت میں مبتلا ہو۔ دوسرا جو سر پر منڈلاتی ہوئی ذلت و رسوائی سے بچنا چاہتا ہو' تیسرا وہ جسے زرِ فدیہ ادا کرنا ہو)۔ (ابوداؤد و ترمذی)

یہ اعلیٰ صفات آپ کی سیرت پاک میں خالق کائنات سے ربط و ہم آہنگی کے تحت' اس طرح مربوط اور ایک دوسرے پر اثر انداز تھیں کہ نہ تو خودداری میں نخوت کا شائبہ تھا نہ رواداری میں شر سے مصالحت کی جھلک تھی۔

❀❀❀

رسول اکرمؐ کا پیام حیات نو

روسو کا قول ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے' لیکن ہر جگہ وہ پابہ زنجیر ہے یہ زنجیریں ہی انسان کی روح اور ذہن کو وقتاً فوقتاً جکڑ لیا کرتی ہیں مختلف اقسام کی اور متعدد ہوتی ہیں۔ باطل اوہام' فرسودہ عقائد' اصول اور قواعد جو اپنی افادیت کھو بیٹھتے ہیں' سماجی تنظیم جو حالات زمانہ سے مطابقت نہیں رکھتی' سماج کے بالائی طبقہ کا عوام پر جابرانہ تسلّط' وہ موانع ہیں جن کی وجہ سے انسانی روح آزادانہ حرکت کے قابل نہیں رہتی' ذہن پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ درپیش مسائل سے کامیابی سے نمٹے۔ مستقبل کی جانب انسان کی دلیرانہ پرعزم پیش قدمی رک جاتی ہے' وہ رجائیت اور حوصلہ مندی کی نعمتوں سے محروم اور مجبوری اور بے بسی کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسانی ذہن اور روح کی حیات حرکت پیہم میں مضمر ہے اس قید و بند میں دونوں پر مردنی چھا جاتی ہے۔ ایسے نازک مرحلوں پر بارگاہ ایزدی سے نوع انسانی کو حیات بخش پیام ملتا رہا ہے جس سے اس کو حیاتِ نو حاصل ہوتی رہی ہے۔ ابدی حقائق کا حامل یہ پیام خدا کے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ نوع انسانی کو ہر زمانہ میں پہنچتا رہا ہے۔ جس قوم نے اسے قبول کیا وہ ہر قید و بند سے رہائی پا کر حیاتِ نو سے لذت آشنا اور شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتی رہی۔ اس پیام کو قرآن میں دین قیم سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے اہم عناصر قابل غور ہیں۔ زندگی کے سفر میں انسان کے دو رہبر ہیں' عقل اور ایمان۔ ان کے مابین تعاون اور توازن کا قیام ضروری ہے۔ ہر فرد پر اس کے افعال کی پوری طرح ذمہ داری ہے سعی پیہم ماجور و مشکور ہے۔ اگر وہ صحیح سمت میں ہو۔ انسانوں میں اتحاد کا قیام اور تحفظ' انسانوں سے محبت و مودّت کے روابط' خدا سے قربت کے شعور کی پرورش اور نشو و نما تکمیل ذات کے درجاتِ عالیہ کی جانب صعود ہے' جس انسانی گروہ نے اس دین قیم کو قبول کیا وہ ترقی اور کامرانی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ لیکن یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ہر دین غل و غش سے آلودہ اور مختلف بندشوں میں مقید ہوتا رہا جو قوتیں دین پر کمند افگنی کرتی ہیں ان پر غور ضروری ہے تا کہ ہم ان سے خبردار رہیں اور دین کی تازگی اور حیات بخشی کو برقرار رکھ سکیں ہر قوم کو اپنے دین سے گہرا جذباتی ربط رہتا ہے اور وہ اسے اپنا

عزیز ترین سرمایہ سمجھتی ہے تقسیم کار کے اصول کے تحت بعض افراد اپنی صلاحیتوں کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ مگر ان کا جوشِ خدمت انھیں ان حدود سے تجاوز کرنے کی ترغیب دیتا ہے جن کے جواز کی ضمانت عقل اور ایمان فراہم کرتے ہیں۔ ابتدائی شکل میں دین سادہ بے رنگ اور صرف چند اساسی حقائق پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو ہر ذی عقل انسان کے لئے قابل فہم اور قابل عمل ہوتے ہیں۔ حامیان دین کی انتھک مساعی سے اس چھوٹی سی بنیاد پر ایک عالیشان عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔ جو اپنی عظمت و رفعت، وسعت و تنوع سے عالم انسان کو متحیر اور مرعوب کرتی ہے۔ دین تک تو ہر عام انسان کی عقل رسائی رکھتی ہے لیکن علم دین جو سینکڑوں بلند پایہ علماء کی ذہنی کاوشوں موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں کا ماحصل ہے، عام انسان کی رسائی سے باہر ہے اِسے سمجھنے کے لئے عالمِ دین کی ماہرانہ رہبری اور اعانت ضروری ہے۔ علم دین کی اہمیت اور اعلیٰ قدر و قیمت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن دین اور علم دین میں فرق و امتیاز بھی ضروری ہے۔ دو فرق خاص طور پر اہم ہیں۔ دین ابدی ہے۔ علم دین انسانی دماغ کی تخلیق اور ہم رنگِ زمانہ ہونے پر مجبور ہے۔ جس زمانہ میں وہ تشکیل پاتا ہے اس کے نقطہ نظر، روح عصر اور پسندیدہ اقدار اس میں سرایت کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہر زمانہ میں اس کی جدید تدوین ضروری ہوتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ علم دین میں وہ زبردست حرکی قوت نہیں پائی جاتی جو دین میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے دیندار ہر میدان عمل میں دوسروں سے سبقت لے جاتا ہے۔ علم دین کو اگر مفید و کارآمد اور انسانی ترقی کے لئے ممد و معاون ہونا ہے تو اس میں دو صفات کی موجودگی ضروری ہے ایک تو یہ کہ وہ روح عصر کی عکاسی کرتا اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ دوسرے دین قیم سے اس کو حیات نو مسلسل ملتی رہے۔ ان دو صفات کے ساتھ علم دین قوم کا گراں بہا سرمایہ اور اس کی ثقافت کا مرکزی عنصر ہو سکتا ہے۔

رسول اکرمؐ کی وساطت سے انسانوں کو آخری پیام ربانی پہنچا چونکہ یہ آخری پیام تھا اس میں وہ خصوصیات پائی جانی ضروری ہیں جن کی وجہ سے مزید وحی اور رسالت کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ان ہی خصوصیات پر توجہ مرتکز کرنے ہم اس کی ماہیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ (اولاً خدا اور انسان کے مابین راست تعلق کی اس طرح وضاحت کر دی گئی کہ اس بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے اور اس میں مداخلت کا ممکنہ حد تک سدِ باب ہو جائے۔ ہر زمانہ میں مذہب کی تفہیم اور مذہبی مسائل کی تشریح کا فریضہ ایسے افراد کے سپرد کیا جاتا رہا جو اپنے علم و ذہانت کی وجہ سے اس کے موزوں تھے یہ گنے چنے

افرادعوام کو مذہبی شعائر کی مناسب بجا آوری کے متعلق سے بھی ضروری ہدایت دیا کرتے تھے۔ تقریباً ہر مذہب میں پروہتوں یا PRIESTS کا طبقہ پیدا ہو گیا۔ جس کا تعلق مذہب سے صرف روحانی نہیں بلکہ اس کا معاشی مفاد بھی اس سے وابستہ ہو گیا)۔ اپنے اعلیٰ خصوصی موقف کی بدولت یہ طبقہ انسان اور خدا کے مابین وساطت کا مدعی ہو گیا۔ اسلامی معاشرہ میں بھی یہ رجحانات وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے اور تقویت پاتے رہے۔ لیکن دین کے صریح اور محکم اصول کی موجودگی میں وہ ایک حد سے کبھی تجاوز نہیں کر سکے اور دین کی سالمیت کو کوئی شدید صدمہ نہیں پہنچ سکا۔ دین کا ہر عنصر ان کی خودی کے تحفظ اور استحکام کا ضامن رہا ہے۔

ثانیاً اسلامی دین میں انسان اور خدا کے مابین تعلق کا ایک بلند باثروت اور حرکی تصور پیش کیا گیا ہے۔ یہ تعلق نہ صرف متعدّد پہلو اور ابعاد رکھتا ہے بلکہ انسان کے علم اور تجربہ میں اضافہ کے تناسب سے ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ کی پیش بینی بھی اُسی سے وابستہ ہے علاوہ ازیں یہ تصور انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ خدا سے تعلق کو بلند سے بلند تر کرتا جائے اور کسی سطح کو آخری نہ سمجھے بلکہ اس سے بلند تر سطح پر صعود کرنے کی پیہم میں مصروف رہے۔

"وَجَاهِدُوْا فِی اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" اور "وما قدرو اللّٰه حَقَّ قَدْرِهٖ"

ترجمہ: "اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے" اور "انھوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی جیسا کہ اس کا حق ہے"۔

(یہ آیات انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ خدا سے ربط کو مسلسل محکم تر اور ارفع تر کرتا جائے خدا سے تعلق کے دو پہلو خاص طور پر قابل غور ہیں یہ پہلو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں۔ یہ پہلو رغبت اور گریز کے ہیں رغبت کے ساتھ محبت کا جذبہ ہے اور گریز کے ساتھ خوف کا محبت انسان کو خدا سے قربت پر مائل کرتی ہے اور خوف اسے دوری پر مجبور کرتا ہے خدا کے تعلق سے یہ متضاد رجحانات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ خدا نہ صرف رحمتِ کاملہ کا مظہر ہے بلکہ عظمت لامحدود کا حامل بھی ہے۔ لامحدود انسان کے لئے نہ صرف کشش رکھتا ہے بلکہ اسے خائف اور مرعوب بھی کرتا ہے۔ قرآن میں ہدایت کی گئی ہے کہ انسان خدا کی جانب خوف و رغبت سے متوجہ ہو۔ ان دونوں رجحانات اور جذبات کے امتزاج اور ان کے مابین توازن سے وہ لطیف کیفیتِ نفسی رونما ہوتی ہے جو حقیقی معنٰی میں احساس عبدیت ہے۔ دین کا

اقتضاء یہ ہے کہ اس دوگونہ تعلق کا وقوف انسان کے شعور یا تحت الشعور میں موجود اور اس کی زندگی اور کردار پر اثر انداز ہوتا رہے)۔

ثالثاً دین قیم ایسے محکم اور ابدی اصول کا حامل ہے جو زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہیں اور جو ہر زمانہ میں اور ہر خطّہ ارض پر بلکہ ہر گوشہ کائنات میں جہاں حیات ممکن ہے انسان کی مکمل رہبری کر سکتے ہیں۔اس کی صداقت کا یہی کافی ثبوت ہے۔اس مختصر مضمون میں صرف ایک ایسے محکم اصول کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْھَهٗ اِلَى اللهِ وَھُوَ مُحْسِنٌ" فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی

وَاِلَى اللهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔

(جو شخص حوادث زمانہ کو تسلیم و رضا کے ساتھ برداشت کرے اور اپنی پر عزم کوششوں سے جس آفت کو نہ ٹال سکے اس پر صبر کرے اور مرضیٔ خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کرے علاوہ ازیں ذی حیات ہستیوں کی فلاح و بہبود میں مصروف رہے اس نے ایسے قبضہ محکم کو پکڑ لیا ہے جو اسے ہر تاریکی اور طوفان سے باہر نکال لے جائے گا اور کسی خطرہ میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا تمام واقعات اس انجام کو پہنچتے ہیں جو خدا نے ان کے لئے مقدر کیا ہے انسان اگر اس اصول کو مضبوطی سے تھام لے وہ یقیناً فلاحِ دارین کے مستحق قرار پائے گا)۔

اسلامی ذہن کی آخری اور اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اپنی تجدید اور احیاء کے ذرائع کا حامل ہے اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ ایک ابدی پیام ہے۔سماجی عوامل کی وجہ سے جب کبھی روح انسانی پابہ زنجیر ہو جائے اور قید و بند میں دم توڑنے لگے۔تو اس پیام کی طرف رجوع ہونے اور اس کے مہیا کردہ ذرائع کو کام میں لانے سے وہ پھر آزاد اور فضائے کائنات میں پرواز کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام ہر زمانہ میں پیام حیاتِ نو ہے۔اب تجدید کے اس موثر عامل پر غور کیجئے جو اس پیام کا جزو لاینفک ہے)۔

اسلام میں عقلِ انسانی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور ایمان اور عقل میں تعاون اور توازن اس کا مابہ الامتیاز قرآن میں بار بار انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی فکری صلاحیتوں سے کام لیتا

رہے۔ اور انھیں معطل نہ رکھے۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے اسلام کی جو بیش بہا خدمت انجام دی وہ عقل وایمان کے رشتہ کی توضیح اور دین میں عقل کے مقام کا تعیّن ہے (ان کی رائے میں ختمِ رسالت اسی وجہ سے ممکن ہوئی کہ عقل انسانی اس بلند زینہ پر پہنچ گئی تھی کہ وحی کی نیابت کامیابی سے کرسکے) ملّتِ اسلامیہ نے جب عقل کو اس کا خصوصی فریضہ انجام دینے سے باز رکھا وہ روبہ تنزل ہوئی کیونکہ دینِ حق زواید وحواشی کے تلے چھپ گیا۔ عقل ہی اس خس وخاشاک کو دور کرکے اسے روز روشن میں جلوہ افروز کرسکتی ہے۔ علوم دین ہمارا قیمتی سرمایہ اور گراں بہا ورثہ ہیں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وہ انسانی ذہن کی تخلیق نہیں۔ اور مرورِ زمانہ سے ان کی افادیت میں کمی کا تنگی ناگزیر ہے۔ دین قیم ایک عظیم حرکی قوت کا سرچشمہ ہے۔ ذہنِ بین انسانی کا اس سرچشمہ سے ربط قائم ہوتے ہی اس کی تمام خوابیدہ قوتیں بیدار ہوگئیں اور مفید توانائیاں رہا ہوگئیں۔ اسی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اوائلِ زمانہ کے مسلمان ہر میدان میں دوسری قوتوں سے سبقت لے گئے۔ اگر ان کی فتوحات آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں تو ذہنی اور فکری میدانوں میں ان کے کارنامے کم حیرت انگیز نہیں۔

اب ملّتِ اسلامیہ کی توانائیاں عرصہ سے ساکن اور منجمد ہیں۔ عقل وایمان کی روشنی میں رسول اکرمؐ کے پیامِ حیاتِ نو کو ذہن میں جذب کرنے سے ہی ان میں حرکت آسکتی ہے اور ان کی موثر کارکردگی ممکن ہوسکتی ہے۔ اگر ملّت' خلوص قلب سے اس کی طرف رجوع ہوتو پھر ہر میدان میں اس کی پیش قدمی ممکن ہوگی اور اس کے سیل رواں کو کوئی دنیوی طاقت نہیں روک سکے گی۔ دنیا یہ دیکھ لے گی کہ

آخر تپش اس آتشِ خاموش میں آئی جاں گرمیِ غیرت سے غضب جوش میں آئی

اب ذرا ان موانع پر نظر ڈالئے جو عقل وایمان کے تعاون کی راہ میں حائل ہیں۔ بلند مرتبت علماء کی صدیوں کی ذہنی کاوشوں اور موشگافیوں سے قوم کو علم دین کا ایک وافر ذخیرہ میسّر ہوگیا ہے اس ذخیرہ سے بھی ان کی زبردست جذباتی وابستگی ہے اور وہ اس کے کسی حصہ سے دست بردار ہونے تیار نہیں۔ اسلام اُن کے ذہن میں جملہ علوم دین پر مشتمل ہے۔ ان کی نظر میں پیام حیاتِ نو' یا دین قیم جو صرف چند حقائق پر مشتمل ہے۔ بغیر سابقہ علماء اور فقہی تشریحات توضیحات اور تکمیلی تفصیلات کے ناکافی ہے۔ انہیں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ محض حجم قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ ایٹم میں جو عظیم قوت پنہاں ہے تو وہ

خاک میں نہیں۔ مِلّت اسلامیہ اسی وقت خودساختہ قیود سے رہائی حاصل کرسکتی ہے۔ جب کہ اس کی زمام قیادت اقبال کے ہم نواؤں کے ہاتھ میں ہو۔

صورت نہ پرستم من تبخانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من

رسول اکرمؐ کے پیام کو جذب کرنے سے ہی مِلّت اسلامیہ کی منجمد روح سیلِ سبک سیر کے روپ میں ظاہر ہوسکتی ہے۔

سب مسلمان واقف ہیں کہ رسولؐ اکرم اتحادِ ملّی کو کس قدر اہمیت دیتے تھے آپ کی تاکید تھی کہ قوم کے اتحاد کو ہر قیمت برقرار رکھا جائے اور جو اختلافات رونما ہوں انھیں صلح وآشتی کی فضا میں ترغیب وتفہیم سے رفع کیا جائے۔ اختلافِ رائے' آزادنہ رائے کا لازمی نتیجہ ہے اختلاف سے قومی اتحاد کو کوئی خطرہ نہیں بشرطیکہ اس کا سامنا صبر وتحمل' بردباری اور رواداری سے کیا جائے۔ اور قائدین مِلّت اشتعال کے باوجود مصالحت کی مساعی سے دست کش نہ ہوں ارشاد خداوندی ہے کہ:۔

اِنَّمَا الْمُؤمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحوا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوااللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ.

(سورۂ الحجرات، آیت:۱۰)

ترجمہ: (یادرکھو) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (سورۂ الحجرات، آیت:۱۰)

ارشاد نبویؐ ہے کہ اتحاد حیات بخش ہے اور انتشار وافتراق تباہی کا پیش خیمہ۔

❀❀❀

اسوۂ نبویؐ اور عصرِ جدید

عہد جدید اور عہد قدیم کا فرق: کائنات اور زندگی کے متعلق انسان کا نقطہ نظر زمانہ کے ساتھ بدلتا جاتا ہے عصرِ جدید کا زاویہ نگاہِ عہد قدیم سے بہت کچھ مختلف ہے۔ دو اختلافات خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ زمانہ قدیم کا انسان زندگی کی بے ثباتی سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اس کی تمنائیں زیادہ تر عقبیٰ سے وابستہ تھیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی کامیابیوں کی وجہ سے عہد حاضر میں انسان کی توجہ عقبیٰ سے ہٹ کر دنیوی زندگی پر منتقل ہوگئی ہے۔ سائنس کی تحقیق میں شغف وانہماک کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی ذہن کا واحد اور بالکلیہ تشفی بخش موضوع فطرت ہوگئی اور اس پر تصرف اس کا واحد مقصد حیاتِ زندگی کی ناپیداری کو تسلیم کرتے ہوے موجودہ انسان اس سے ممکنہ حد تک متلذذ اور لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ یہ باور کرتا ہے کہ اسی کے لئے وہی شئے قدر و قیمت رکھتی ہے جو اس کی دسترس میں ہے۔ عصر جدید کے انسانی ذہن کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لئے وہی بات قابل قبول ہے جس کی کڑی کہیں نہ کہیں عالمِ فطرت سے مل جائے اُسے قدم جمانے کوئی نہ کوئی محسوس زینہ درکار ہے۔ لیکن اس زینہ کو چھوڑ کر فضائے بسیط میں پرواز کرنا اسے قطعاً منظور نہیں۔

دین و دنیا کا توازن: اسوۂ رسول اکرمؐ جس تعلیم ربانی کو قول وفعل کے لباس میں جلوہ گر کرتا ہے اس کی بعض خصوصیات عہد حاضر کے انسانی ذہن کے لئے خاص جاذبیت اور کشش رکھتی ہیں پہلی خصوصیت جو اسے دوسرے مذاہب اور کسی دوسرے فکری نظام سے ممتاز کرتی ہے وہ دین و دنیا' روحانیت و مادیت اور عالم شہود اور عالم غیب کے مابین توازن اور ربط کا قیام ہے۔ سابقہ ادیان میں کسی ایک رکن کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی تھی کہ دوسرا نہ ہونے کے برابر ہوگیا۔ بدھ مت و ہندو مت اور ایک عہد تک عیسائیت میں عقبیٰ پر حد سے زیادہ زور دیا گیا۔ دنیوی زندگی کی اہمیت صرف اتنی رہ گئی کہ وہ نفس کشی کے مواقع فراہم کرتی ہے اس کے بر خلاف کنفیوشیس کے مذاہب اور سائنس کے فکری نظام میں عالم آخرت بمنزلہ صفر ہوگیا اور انسان کے تمام اغراض اسی زندگی تک محدود ہو گئے۔ اسوۂ رسولؐ جس قرآنی تعلیم کو منعکس کرتا ہے اس کی رو سے عالم فطرت بامعنٰی ہے اور ذاتی قدر کا حامل ''ربنا ما خلقت هذا باطلا''

انسان کو حق ہے کہ اس کے جملہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو اور اس کی قوتوں پر علم وفن سے تصرف کرے فطرت کو سمجھنے اس پر غور وفکر کرنے اور اسے تسخیر کرنے کی واضح تاکید کی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ تلقین کی گئی کہ خدا اور عالمِ ابدی کا احساس شعور سے پیوست رہے اور اسی احساس کے تحت دنیوی زندگی بسر کی جائے۔ حدیث شریف ہے کہ انسان پر نفس کا بھی حق ہے قرآنی تعلیم کی دوسری خصوصیت جس کا پر تو اسوۂ رسولؐ میں نظر آتا ہے، وہ خاص اہمیت ہے جو محاسنِ اخلاق اور قربِ خداوندی کو دی گئی ہے۔ عبادتوں اور ریاضتوں کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے کیونکہ وہ اخلاق وخوبیوں کے اکتساب کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ متعدد ذرائع میں سے ایک ہیں۔ عبادت کو اوّلیت دینے سے انسان کی توجہ اپنی ذات اور ذاتی مفاد پر مرتکز ہو جاتی ہے اور سماج سے اس کا رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور وہ روحانی تکبر کی جانب مائل ہونے لگتا ہے دوسرے انسانوں سے خود کو برتر اور ممتاز سمجھنے لگتا ہے۔ اسوہ رسولؐ اس پر شاہد ہے کہ حقیقی اہمیت سماجی معاملات میں صداقت و دیانت داری، فروتنی وانکسار سماجی اصلاح کے پر خلوص جذبہ، انسانوں سے ہمدردی اور رواداری، بہبود عامہ کی لگن اور شیوہ، تسلیم ورضا کو حاصل ہے۔ عبادت اس طرف رجوع کرتی ہے تو مستحسن ہے ورنہ نہیں، قرآنی تعلیم کی تیسری خصوصیت جو اسوۂ رسولؐ میں ملتی ہے وہ باعزت مقام ہے جو جسمانی محنت کو عطا کیا گیا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہر قوم میں ان ہی افراد کو خاص اعزاز اور بلند مرتبہ حاصل رہا جو دماغی کام یا روحانی ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ یہی کام اعلیٰ قدر کے حامل تصور کئے جاتے تھے اور جسمانی محنت کو بالعموم بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا تھا اس لئے ہر مملکت میں اقتدار دانشوروں یا مذہبی رہنماؤں کو حاصل تھا۔ کمیونزم کی تحریک اقتدار کے اسی ارتکاز کے خلاف پیدا ہوئی۔ رسول کریمؐ نے اپنے قول وفعل سے مسلمانوں کے ذہن نشین کیا کہ جسمانی محنت ویسی ہی قدر و برتری کی حامل ہے جیسے کوئی دماغی یا روحانی فعلیت۔

اقدار کا سرچشمہ احساسِ رب: آپؐ نے واضح کیا کہ قدر کا منبع خدا کا شعور واحساس ہے اور جسمانی محنت اگر اس شعور کے تحت ہو تو اعلیٰ ترین قدر کی حامل ہے۔ جسمانی محنت سے روزی کمانے والے یعنی مزدوروں کو آپ نے سماج میں اہم اور باعزت مقام عطا کیا حدیث شریف ہے کہ جسمانی محنت سے اکل حلال حاصل کرنا بہترین عبادت ہے۔ عبادت کا یہ وسیع اور واضح تصور مسلمانوں کو آپؐ کا گراں بہا عطیہ ہے۔ حدیث شریف ہے کہ آپؐ نے ایک مزدور کے سخت اور گھٹے پڑے ہوئے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ دوزخ کی آگ انھیں کبھی نہیں چھو سکتی۔ چوتھی خصوصیت وہ خاص اہمیت ہے جو علم کو دی

گئی۔ حدیث شریف میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ اگر علم دنیا کے بعید ترین گوشہ میں ملتا ہو تو وہاں جا کر اسے حاصل کریں ایک دوسری حدیث شریف میں علم سیکھنے اور سکھانے والے کو عابد و زاہد سے افضل قرار دیا گیا ہے چونکہ حصول علم کا واحد ذریعہ عقل ہے عقل کو اسلام میں مسلمہ حیثیت حاصل ہوئی۔

ارتقائے مسلسل: اس تعلیم کی پانچویں خصوصیت وہ خاص مقام ہے جو ترقی اور مدارج عالیہ کی جانب صعود کو عطا کیا گیا۔ انسان کا کام ایک مقام پر جے رہنا نہیں بلکہ بلندیوں کی طرف زینہ بہ زینہ پیش قدمی کرنا ہے۔ وَلَتَر کَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ انفرادی اور سماجی گونہ گوں ترقی ہمیشہ جاری رہنی چاہیئے فرد علم اور بصیرت میں آگے بڑھتا جائے اور قربِ خداوندی کا مستحق ہو۔ اور سماج کو مسلسل اصلاحات کے ذریعہ عدل و انصاف اور انسانی مساوات کی مستحکم بنیاد پر قائم کیا جائے۔ قرآنی تعلیم کی یہ خصوصیات عصرِ جدید کے لئے خاص جاذبیت رکھتی ہیں' اسوۂ رسولؐ میں ان سب کی جھلک نظر آتی ہے۔

رسول اکرمؐ مصلح اعظم اور ہادی برحق تھے۔ آپ نے مسلمانوں کے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ جس سمت میں انہیں بڑھنا چاہیئے اس کی نشاندہی فرمائی اور جس بلند منزل تک انھیں پہنچنا چاہیئے اس کا تعین فرمایا۔ اس راہ پر آپؐ اپنے متبعین کو اتنی دور لے گئے جتنی دور جانے کی ان میں قوت اور صلاحیت تھی۔ آپ کی پرزور خواہشیں تھی کہ انہیں منزل مقصود سے قریب اور قریب تر کرتے جائیں مگر ان کی کوتاہیوں کے پیش نظر آپ کو صبر کرنا پڑا قرآن شریف میں آپ کو ہدایت کی گئی کہ اپنے گرد و پیش کی سست رفتاری سے مضطرب یا مایوس نہ ہوں انسان میں ترقی کی صلاحیت محدود ہے مگر اہم بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے اور اپنی قوت کے مطابق آگے بڑھے۔ حیوان کی طرح ہانکا نہ جائے۔ اس موقع پر قدرتاً یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ کیا ہم بحیثیت ایک قوم کے آپ کی رہبری سے کما حقہ مستفیض ہوئے اور کیا ہم اس راہ ترقی پر مسلسل گامزن رہے جس کی جانب آپؐ نے رہنمائی کی تھی۔ دیانتِ فکری کا تقاضہ ہے کہ ہم اس کا جواب نفی میں دیں اور اپنی کوتاہی پر نادم و خجل ہوں۔

ابتدائی دور میں مسلمان جس مقام پر پہنچے تھے وہ مقصود کی جانب پہلی منزل تھی۔ قوم نے غلطی سے سمجھا کہ وہ آخری منزل ہے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ مگر عالمِ شہود میں حرکت و تغیر کا راج ہے۔ حرکت کو اگر آگے کی سمت روک دیا جائے تو لازماً اس کا رخ پیچھے کی طرف ہو جائے گا۔ یہی ہوا قوم ترقی کے بجائے روبہ تنزل ہوگئی اس پر ہمیں متعجب نہیں ہونا چاہیئے، اسلام کی روح ترقی کی روح ہے۔ ترقی سے منہ موڑ کر ہم نے اسلام سے منہ پھیر لیا اور اس خود فریبی میں مبتلا رہے کہ ہم اسلام پر قائم

ہیں سماجی زندگی کے جس زینہ پر ہم نظر ڈالیں یہی دیکھیں گے کہ ہم اس راہ پر گامزن رہنے سے قاصر رہے جس کی طرف اسوۂ رسول اکرمؐ نے ہماری رہنمائی کی تھی۔

انسانوں کے مابین کشمکش: ہر زمانے میں امیر و غریب دولت مند اور مفلس کے مابین ایک خلیج حائل رہی اس کی وجہ سے سماج دو طبقوں میں منقسم رہا۔ سرمایہ دار اور نادار طبقوں کے باہمی آویزش اور کشمکش ہمیشہ سے سماج کے انتشار اور عدم استحکام کا باعث رہی ہے جب بھی یہ کشمکش تصادم پر منتج ہوئی تو سیاسی انقلاب نے مملکت کا خاتمہ کر دیا۔

عصر حاضر میں نادار طبقہ زیادہ طاقتور اور منظم ہو گیا ہے اور ذرائع پیداوار پر بہر قیمت قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کمیونسٹ اور سرمایہ دار ممالک میں تصادم ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اور انسانی تہذیب کے لئے عظیم خطرہ درپیش ہے۔ رسول اکرمؐ نے امیر غریب کے باہمی فرق کو گھٹانے کی موثر تدابیر اختیار کیں اور بالآخر طبعی سماج کی تشکیل کے لئے راہ ہموار کی۔ زکوٰۃ۔ خیرات۔ صدقات اور وراثت کے قوانین اسی عظیم منصوبے کے اجزاء تھے جس کا مقصد معاشرہ میں قومی دولت کی منصفانہ تقسیم تھا اگر یہ منصوبہ تکمیل کو پہنچایا جاتا تو مسلم معاشرہ کو طبقاتی کشمکش سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جاتی اور معاشی مساوات کی بنیاد پر ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پا جاتا۔ افسوس ہے کہ مسلمان اس راہ پر پیش قدمی کرنے سے قاصر رہے جس کی طرف اسوہ رسول اکرمؐ نے ان کی رہنمائی کی تھی۔

میدان سیاست میں رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کی رہنمائی ایک حقیقی جمہوری نظام حکومت کی جانب کی۔ آپ نے بادشاہت' آمریت اور موروثی امارت کو قطعاً رد فرمایا۔ اور سیاسی اقتدار بالکلیہ پوری قوم کو سونپ دیا۔ انسانی مساوات کا جو مستحکم اصول آپ نے پیش کیا تھا۔ جمہوریت اسی کا سیاسی روپ تھا۔ افسوس ہے کہ اس بارے میں مسلمان اسی مقام پر بھی قائم نہ رہ سکے جو انہوں نے ابتدائی دور میں حاصل کر لیا تھا۔ اور صدیوں تک مسلم اقوام مطلق العنان حکمرانوں کے تابع فرمان رہیں۔ جمہوریت کا تصور مسلمانوں کے تحت الشعور میں رہا مگر خوابیدہ۔ اب وہ بیدار ہوا ہے تو بھی اسلامی جمہوریت کا احیا نہیں کہہ سکتے بلکہ مغربی جمہوریت کی کورانہ تقلید ہے۔ زر خرید رائے دہندگان اور مفاد پرست قائدین۔ ان کے درمیان انتخاب نمائندگان ایک ظالمانہ مذاق ہو کر رہ گیا ہے۔ اسوہ رسول کی رہنمائی میں ہی ایک صحت مند جمہوریت کا قیام ممکن ہے۔ اب اس سوال کو لیجئے کہ مذہب کے تعلق سے اسوۂ رسول اکرمؐ ہماری رہنمائی کی سمت میں کرتا ہے۔ ارشاد نبوی میں مذہب کا لطیف پاک اور خالص

تصور پیش کیا گیا ہے۔ آپ کی نظر میں خدا سے وابستگی اور توسّل کے احساس سے شعور انسانی کا رچا ہوا رہنا مذہب ہے۔ اس کی عروۃ الوثقیٰ پر جب ہماری ذہنی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو ہم فروعات اور غیر اہم تفصیلات میں الجھ کر رہ گئے اتحاد کی جگہ انتشار نے لے لی۔ ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ کیوں کہ ہم لایزال کا دامن چھوڑ کر کسی نہ کسی فانی ہستی یا ذاتی حرص ہوا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

زندگی کے اعلیٰ مقاصد: آپؐ نے عبادت کا ایک وسیع وارفع تصور پیش کیا اور اپنے کردار سے اس پر مہر تصدیق ثبت فرمادی۔ اس کی رو سے ہر کام جو خدا کے شعور کے ساتھ بلند مقصد کے لئے دیانت داری اور جفاکشی سے انجام دیا جائے عبادت قرار دیا گیا۔ اکتساب علم، محنت سے جائز روزی کمانا، خدمت خلق سب عبادتیں مفقود ہو گئیں۔ حدیث شریف ہے کہ ''کیا میں ایسا کام بتلاؤں جو روزہ نماز اور خیرات سے افضل ہے۔ یہ انسانوں کے مابین مصالحت کرانا ہے۔''

مذہب کی ماہیت

موجودہ زمانے کا شدید تقاضہ یہ ہے کہ مختلف اقوام میں اتحاد پیدا کیا جائے اوران کی باہمی مخالفتوں کوممکنہ حدتک گھٹایا جائے۔آج کل کی دنیامیں اس خیال کوعام قبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے کہ نوع انسانی کی نجات اقوام کے باہمی اتحاد پرمنحصر ہے۔اورغیر معمولی قوت کے ہلاکت آفریں اسلحہ کی موجودگی میں اختلافات کوفروغ دینایا جاری رہنے دینا انسانوں کوتباہی کی طرف لیجانا ہے۔اسی لئے دورجدید کے اکثر بڑے مفکران اسباب کی چھان بین کررہے ہیں جوانسانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرکے انہیں فرقہ پرستی، جماعت بندی اور جنگجو یا نہ وطن پرستی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہ مفکران اسباب کوسمجھ کرانہیں رفع کرنا چاہتے ہیں۔تاکہ تمام اقوام اعلیٰ ترین مشترک مقاصد کی تکمیل میں سرگرم عمل ہوجائیں۔اورانسان کی لامحدودترقی وبہتری کا راستہ نکل جائے۔اس سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ گذشتہ چندصدیوں میں مذہب بھی ان عوامل میں شامل رہا ہے۔جوانسانی جماعتوں میں منافرت وعناد کے ذمہ دار ہیں۔مگراب یہ حقیقت رفتہ رفتہ آشکارہورہی ہے کہ اصل میں مذہب کا غلط تصوراقوام کے باہمی تصادم کا باعث رہا ہے۔اوراصل مذہب جُدا کرنے والی نہیں بلکہ ملانے والی قوت ہے۔مذہب ایک زبردست قوت ہے۔اوراگراس کوصحیح طور پرکام میں لایا جائے تو دنیا بھر کے انسانوں میں ملاپ کے امکانات بہت زیادہ روشن ہوجائیں گے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مختلف مذاہب کے پیرواس سے بخوبی واقف ہوجائیں کہ طوروطریق کے اختلاف کے باوجودان سب کی منزل مقصودایک ہی ہے اور ان حقائق کوجانیں جوسب مذاہب کے لئے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں باہمی مفاہمت کی بہترین خدمت ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جس پرمختلف مذاہب کے نمائندے جمع ہوسکیں۔اپنے اپنے نقطہ نظر سے زندگی کے بنیادی مسائل پرغورکریں۔مختلف مذاہب کے پیروؤں کویکجا کرنا اوران میں باہمی تبادلہ خیال کے مواقع فراہم کرنا ان کوایک دوسرے سے قریب کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔اسی طرح یہ ممکن ہوگا کہ ہرمذہب کے پیرواپنے دلوں کوتعصّبات اور بدگمانیوں سے صاف وپاک کرکے دوسرے مذہب کوسمجھنے اوران کی خوبیوں کی قدرکرنے کی کوشش کریں۔اسی پلیٹ فارم سے نہ صرف یہ فائدہ ہے کہ

مختلف مذاہب کے پیرو باہم دست و گریباں ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے قریب ہوں گے، بلکہ وہ خود اپنے اپنے مذہب کے بنیادی اصول اور حقائق کو بخوبی سمجھنے لگیں گے۔ علاوہ ازیں اس سے ان لوگوں کو بھی موقع حاصل ہوتا ہے جو خود اپنے مذہب والوں کی عام پسندیدہ روش سے ذراہٹ کر کوئی بات کہنا چاہتے ہوں۔

تین اہم سوالات

میرے خیال میں مذہب کی ماہیت سے واقفیت باہمی مفاہمت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ جو لوگ مذہب کی ماہیت سے واقف ہیں ان سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی تعلیم پر ہمدردانہ غور کر سکیں گے۔ اور ان کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کریں گے۔ اس لئے مختلف مذاہب کے باہمی اتحاد کو عزیز رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ اس بحث پر سوچ بچار اور بات چیت کی ہمت افزائی کریں۔ ان چند سطور کا مقصد اسی قسم کے غور و فکر کی ابتداء کرنا ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں مذہب کی ماہیئت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے تین سوالات پر غور کرنا مناسب ہوگا۔ مذہب کا وظیفہ کیا ہے؟ مذہب کس قسم کی ذہنی کیفیت کی پیداوار ہے؟ اور مذہبی جذبہ کا اثر انسان پر کیا ہوتا ہے؟ ان ہی سوالات کا یکے بعد دیگرے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلے سوال کو لیجئے کہ مذہب کا وظیفہ کیا ہے۔ یعنی زندگی کو برقرار رکھنے اور اس کی ثروت میں اضافہ کرنے کی فعلیتوں سے اس کا کیا تعلق ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جاندار عضو خلاء میں وجود نہیں رکھتا۔ وہ گرد و پیش کی قوتوں سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ ان چیزوں اور قوتوں کو مجموعی طور پر ماحول کا نام دیا گیا ہے۔ اور اختصار کی خاطر اسی اصطلاح کو استعمال کیا جائے گا۔ ہر جاندار اپنی زندگی کو اسی وقت برقرار رکھ سکتا ہے کہ اپنے ماحول سے مناسب مطابقت پیدا کرے۔ اس مطابقت میں ذرا سا بھی بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر جاندار زندگی کے دوران میں مسلسل اسی جدوجہد میں مشغول رہتا ہے کہ اپنے اطراف کی چیزوں اور طبعی حالات سے مطابقت قائم کرے اور اسے برقرار رکھے۔ نردبانِ حیات یا جیون کی سیڑھی کے نچلے زینوں پر صرف معدودے چند چیزوں سے مطابقت کافی ہوتی ہے۔ مگر اونچے زینوں پر اشیاء کی زیادہ تعداد اور ان کے زیادہ لطیف پہلوؤں سے بھی مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ کائنات کے جس رقبہ سے مطابقت زندگی کی بقاء کے لئے ضروری

ہے وہ بتدریج زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ حیات کے سب سے اونچے زینے پر انسان ہے۔ اور اسی نسبت سے اس کے لئے لازمی ہے کہ کائنات کے ایسے وسیع رقبے سے مطابقت پیدا کرے جو حیوان کے تصور میں بھی نہیں آسکتے ۔ آخر میں قدرتی طور پر تہذیب علم میں انسان کی ترقی کے ساتھ اس میں پوری کائنات کے ساتھ مطابقت کی خواہش کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ مذہب اسی اہم خواہش کی تشفی کا سامان فراہم کرتا ہے ۔ مذہب انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ پوری کائنات سے مطابقت حاصل کرے۔ ایسی ہمہ گیر مطابقت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کائنات کی ماہیت کا کوئی اندازہ لگائے اور اس کے اور کائنات کے باہمی رابطہ کا کوئی تصور قائم کرے۔ اس مسئلہ کے غور وفکر کے دوران میں تین نقطہ نظر رونما ہوتے ہیں۔

پہلے نقطہ نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات انسان کی مخالف اور دشمن ہے اور ہمیشہ اس کی تخریب وتباہی کے درپے ہے۔ بہت سی مخالف قوتیں ہیں جن سے انسان خود کو بہ مشکل بچاتا رہا ہے۔ ہزاروں مرتبہ کائنات انسان کو ایسی نعمتوں سے اچانک محروم کردیتی ہے جو تقریباً اس کے تصرف میں آچکی تھیں ۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ برسوں کی جدوجہد کے بعد منزل مقصود انسان کے نظر کے سامنے آتی ہے۔ مگر غیر متوقع موانع اس کی راہ میں حائل ہوجاتے ہیں ۔ اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ان تلخ تجربات کی بناء پر اس نتیجہ پر پہونچنا فطری تھا کہ اس کے مدمقابل جو حریف ہے وہ نہ صرف اس سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہے بلکہ اس کی عداوت ومخالفت پر تلا ہوا ہے کہ اس نقطہ نظر کو انگلستان کے مشہور افسانہ نگار ہارڈی نے اپنے افسانوں میں اعلیٰ فنی کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی رائے میں قدرت کے لئے انسان ایک حقیر کھلونا ہے جس کے ساتھ وہ کچھ عرصہ بے دردی اور بے رحمی سے کھیلتی ہے۔ اور جب چاہے اسے توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ مولانا روم نے اس تصور کی طرف اس شعر میں لطیف سا اشارہ کیا ہے۔

تو ساقیٔ خماری یا دشمن ہشیاری
یا آنکہ کئی ویراں ہر خانہ کہ بر سازم

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کائنات حسن وشعور اور رحم ومحبت سے بالکلیہ عاری ہے اور اس لئے اس کو انسان اور اس کی مقصد کوشی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ۔ بلند مقاصد کے تعاقب میں اس کی پیہم تگ ودو، نیکی کے حصول میں اس کی مسلسل عرق ریزی، ترقی کی آرزو میں اس کی شب وروز گرم روی سب

مہمل اور بے فائدہ ہیں۔ اس لئے کائنات میں ان کی کوئی قدر شناسی پائی نہیں جاتی۔ کائنات اس سے قطعاً بے پرواہے۔ وہ نیک کام کرے یا برے ترقی کرے یا تنزل۔ کائنات کی نظر میں سب یکساں ہے نہ نیکی کا کوئی بدلہ ہے نہ برائی کی سزا' خیر وشر اس کے معیار فطرت میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اور نہ انسانی دائرہ سے باہر ان کا کسی چیز پر اطلاق ہوسکتا ہے نیکی بدی انسانی تصورات ہیں۔ اور اس کے محدود ذہن کی پیداوار' اس کے خاتمہ کے ساتھ ان کا بھی خاتمہ ناگزیر ہے۔

سائنس فطرت کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ بڑی حد تک اس نقطہ نظر کے مطابق ہے۔ اقبال نے اپنی نظم تنہائی میں اس نقطہ کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

شدم بہ حضرت یزدان' گزشتم ازمہ و مہر
کہ در جہاں تو یک ذرہ آشنا یم نیست

آخری نقطہ نظر مذہب کا ہے قرآن پاک میں اس کو اس طرح پیش کیا گیا ہے

هُوَ اللّٰهُ الَّذِى لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْم۔ یعنی انسان کو خارج میں جس عظیم ہستی سے مطابقت کرنی ہے وہ لامحدود عقل وشعور کی حامل ہے اور محبت ورحم کی اعلیٰ ترین صفات سے متصف عقل و رحم کا وجود محض کائنات کی سطح پر نہیں اس کی بنیاد پر ہے۔ انگلستان کے مشہور مفکر برٹرنیڈ رسل کی رائے میں دو ہی صفات ہیں جو اعلیٰ ترین قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ اور حقیقت میں ہماری تعظیم وتکریم کی مستحق ہیں۔ یہ دو صفات محبت اور عقل ہیں۔ قرآن پاک میں ان کو کائنات میں مرکزی مقام دیا گیا ہے اور اس آیت میں خدا کی ذات سے انہیں خاص طور پر منسوب کیا گیا ہے۔ اِس نظریہ کے مضمرات انسان کے لئے دور رس نتائج رکھتے ہیں۔ جس ہستی سے انسان کو مطابقت کرنی ہے۔ وہ انسان کے ظاہری اعمال سے بھی واقف ہے اور اس کی پوشیدہ نیتوں سے بھی۔ اخلاقی ترقی میں انسان کی کوششیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ رتی برابر نیکی بھی وہ کرے تو خدا اس کو محفوظ کردیتا ہے۔ اور وہ کائنات کے مجموعی سرمایہ خیر میں ہمیشہ کے لئے اضافہ کردے گی۔ اس کوشش میں انسان ناکام ہوجائے تو خدا اس سے ہمدردی کرنے اور اس پر رحم کرنے اور اس کی مدد کرنے ہمیشہ تیار ہے۔

کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کے یہی تین نظریئے ممکن ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان میں کون حقیقت کے مطابق ہے۔ محض عقلی دلائل اور تجربی شہادت سے کسی کو قطعی طور پر ثابت کرنا ممکن

نہیں۔مگر انسانی زندگی پر ہر ایک کے مختلف اثرات کے لحاظ سے ہم مذہبی نظریہ کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں۔پہلے دو نظریوں میں سے کسی کو بھی قبول کریں۔انسانی زندگی بے معنی بے مقصد مہمل نظر آتی ہے۔ ایک خواب پریشان سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے مذہبی نقطہ نظر کو اختیار کرنے سے زندگی میدانِ عمل کی شکل اختیار کرتی ہے۔انسان کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔حصولِ خیر کے جذبہ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔زندگی کا سفر ایک مہم ہو جاتا ہے عقل ومحبت کے فرشتوں کی معیت میں آخری مقصود کی جانب منزل بہ منزل ترقی کرتا جاتا ہے۔موت کو دروازہ سمجھنے لگتا ہے جس کے کھلتے ہی وہ خود کو ایک بلند تر سطح وجود پر گامزن پائے گا۔

مذہب کی ماہیت کو بخوبی سمجھنے کے لئے اس ذہنی کیفیت پر غور کرنا چاہیئے جس میں مذہب کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت عام ذہنی کیفیات سے بہت مختلف ہے مگر اس کی نوعیت کیا ہے۔انگلستان کے مشہور فلسفی وائٹ ہیڈ نے اپنی تصنیف تکوین مذہب میں اس رائے کو پیش کیا ہے۔ کہ حقیقی مذہب انسان کے شدید احساس تنہائی کی پیداوار ہے۔عام انسان اس احساس سے تمام عمر بیگانہ رہتے ہیں۔ان کے خیالات‘ تاثرات‘ جذبات‘ عقائد وہی ہوتے ہیں جو ان کی قوم میں مروج ہیں۔وہ دوسروں کے ساتھ سوچتے‘ خوشی یا رنج محسوس کرتے رہتے ہیں۔ان لوگوں کا مذہب دوسروں سے عاریتاً لیا ہوا ہوتا ہے۔مگر شاذ و نادر ایک انسان ایسا بھی نکل آتا ہے جس میں اپنی انفرادی ذات کا شعور قوت اور شدت کے ساتھ اس کے قلب پر مسلط ہوتا ہے۔اس شعور کی بدولت وہ کائنات کے مقابل کھڑا ہوتا ہے۔اور اس سے براہ راست معاملے کا مطالبہ کرتا ہے۔اسی ذہنی حالت میں حقیقی مذہب جنم لیتا ہے۔وائٹ ہیڈ کی رائے میں یہ ذہنی کیفیت بڑے بانیان مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ مہاتما بدھ پیپل کے درخت کے نیچے حضرت مسیح پہاڑ پر اور آنحضرت صلعم غارِ حرا میں اسی ذہنی حالت میں حقیقی مذہب سے روشناس ہوئے۔اسی کو ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ اس احساس تنہائی کی حالت میں جملہ کائنات سے اعلیٰ ترین سطح پر مطابقت کی پر زور خواہش پیدا ہوتی ہے اور تشفی پاتی ہے۔

آخر میں شعور مذہبی کی ایک خصوصیت کا مختصر ذکر کر دیتا ہوں۔انسان کو اپنی کیفیت ذہنی کا صرف علم ہی نہیں ہوتا وہ اس کی قدر کو بھی محسوس کرتا ہے۔ نفسی تجربات کی قدر کا شعور صرف انسان میں پایا جاتا ہے۔انسان اپنے نفسی تجربات کا قدر کے لحاظ سے مقابلہ کرتا ہے۔اور اس تجربہ کی خواہش کرتا ہے جو قدر کے اعتبار سے زیادہ ذی ثروت ہے۔جو تجربہ زیادہ قدر کا حامل ہوتا ہے وہ لازماً زیادہ تسکین

بخش اور لطف انگیز ہوتا ہے۔ کھانے پینے اور دوسری عام خواہشات کی تشفی کا تجربہ بھی قابل قدر ہے اور اس لئے لذت بخش ہوتا ہے۔ مذہبی شعور کامل اور تشفی تامہ فراہم کرتا ہے اور اس لئے جو افراد اس کا تجربہ رکھتے ہیں اس کو اعلیٰ ترین قدر سے معمور قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اس قیمتی تجربہ سے بے نصیب ہیں انہیں فطری طور پر اس رائے کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ مگر ان سے یہی کیا جا سکتا ہے۔

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

(یہ مقالہ بین الاقوامی مذہبی کانفرنس ۹ر جنوری ۱۹۶۰ء میں پیش کیا گیا)

مذہب کا صحیح تصور

مذہب کے جوشیلے حمایتی ہی نہیں اس کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مذہب کا زندگی سے قریبی تعلق ہے۔اور زندگی پر اس کے طاقتور اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ان اثرات کی نوعیت کے بارے میں البتہ اختلاف رائے پایا جاتا ہے مخالفین کا اصرار ہے کہ مذہب زندگی کی تخلیقی قوتوں کو افسردہ کرتا ہے۔اور باہمی عناد' نفرت اور مخاصمت کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔اس لئے وہ مذہب کو انسان کی معاشرتی و ثقافتی ترقی کے لئے ایک سدراہ قرار دیتے ہیں۔حامیان مذہب کی رائے لازماً اس کے برعکس ہے۔ان کی رائے میں مذہبی نقطۂ نظر زندگی کو پرلطف اور دلکش بنا دیتا ہے۔اس کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔اور اس کی ثروت میں اضافہ کرتا ہے۔علاوہ ازیں ان کا اصرار ہے کہ مذہب انسان کو میل ملاپ' صلح وآشتی اور خدمت خلق کی طرف راغب کر کے سماجی بہبود و ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔

یہ متضاد نظریئے صدیوں سے آپس میں ٹکراتے رہے ہیں اور کسی کو دوسرے پر قطعی اور کامل غلبہ نہیں ہوسکا' انسان کی تاریخ دونوں کے لئے کافی تائیدی شہادت مہیا کرتی ہے مدت تک مذہبی مسائل میں خفیف سے اختلاف پر اقوام کی باہمی آویزش ایک عام بات تھی۔ازمنۂ وسطیٰ میں مذہبی عقائد کے ذرا سے انحراف پر نیک انسانوں کو ناقابل بیان عقوبت اور عذاب سہنا پڑا۔مذہبی جنون میں ہزاروں انسانوں کا خون بے دریغ بہایا گیا۔دوسری جانب ایسی بھی کثیر مثالیں ملتی ہیں کہ مذہب انسانوں کو ملانے متحد کرنے اور ان کے درمیان رابطہ محبت ومودّت کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس صورت حال سے جو ذہنی الجھن پیدا ہوتی ہے وہ اس طرح رفع کی جاسکتی ہے کہ ہم ایک بنیادی سوال کا جواب تلاش کریں۔ یہ سوال جس سے مذہب کے دلدادہ گریز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ کیوں مذہب بعض اوقات ترقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔اور بعض اوقات اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔کیوں وہ کبھی صلح وامن کی طرف لے جاتا ہے۔اور کبھی اس کی مخالف سمت میں؟ جن مفکرین نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے اس پر متفق ہیں کہ مذہب فی نفسہٖ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سنوارتا ہے سدھارتا ہے اور اگر بعض افراد پر اس کا اثر اس کے برعکس پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ ان ہی افراد کے

ذہن میں تلاش کرنی چاہیئے نہ کہ مذہب میں۔ مذہب سے مستفید ہونے کے لئے صرف اس کے نام لیوا ہونا کافی نہیں بلکہ اس کی ماہیت اور دائرہ عمل کا صحیح تصور قائم کرنا بھی لازمی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اکثر جوشیلے اور سرگرم مبلغین کے ذہن میں مذہب کا غلط یا ناقص تصور پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی مساعی مذہب کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچاتی ہیں اور سمجھدار لوگوں کی نظر میں اسے گرادیتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت مذہب کے دو مختلف تصورات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کی تشریح سے اور زندگی پر ان کے جداگانہ اثرات کے مقابلہ سے یہ واضح ہوگا کہ کیوں ایک تصور غلط ہے اور دوسرا صحیح۔

حامیان مذہب اس پر متفق ہیں کہ مذہب کا خاص وظیفہ زندگی میں انسان کی رہنمائی کرنا اور صراط مستقیم سے بھٹک جانے سے اسے باز رکھتا ہے۔ اس رہنمائی کی نوعیت کے متعلق دو مختلف تصورات پائے جاتے ہیں ایک گروہ کا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ مذہب میں ہمیں ایک مکمل ضابطۂ حیات ملتا ہے۔ ان کی رائے میں یہ ضابطہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس میں ہر ممکنہ صورت حال کے لئے بندوبست کرلیا گیا ہے۔ جتنے ان گنت مواقع آئندہ پیش آسکتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے لئے تفصیلی ہدایت ہمیں مذہبی ضابطہ میں مل سکتی ہے۔ یہ لوگ کسی ایسے موقع کا تصور بھی نہیں کرسکتے جس کے لئے ایک مخصوص طریقہ کار نہ بتایا گیا ہو۔ ان کی رائے میں اس ضابطہ کے جملہ قواعد وقوانین پر کاربند رہنے سے ہی نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ بادیٔ النظر میں اس تصور میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ مگر اس پر نظر غائر ڈالنے اس کے مضمرات کی تفتیش کرنے اور اس کے قبول کرنے کے نتائج وعواقب کا جائزہ لینے سے اس کی کوتاہیاں ظاہر ہوجاتی ہیں۔ اول تو اس تصور پر عمل کرنے سے انسان دو گرانقدر نعمتوں آزادی فکر اور آزادی رائے سے محروم ہوجاتا ہے۔ دوسرے یہ امر قابل غور ہے کہ زندگی کی ماہیت حرکت ہے۔ اور اس کی قسمت مسلسل ارتقاء۔ اس ارتقاء کی ہر منزل پر نئی توانائیاں نمودار ہوتی ہیں۔ نئے پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ نئے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اور نئے مواقع اور حالات سے نپٹنا پڑتا ہے۔ بندھے بندھائے اٹل قوانین میں انسان کو جکڑ دینا اس کی زندگی کو منجمد کردینا اور اس کو ذوق ترقی سے محروم کردینا ہے۔

ایک اور اہم اعتراض جو اس تصور پر وارد ہوتا ہے۔ کہ اس کو مان لینے سے انسانی عقل کا دائرہ عمل بالکل ناپید نہیں ہوتا تو بے حد تنگ اور محدود ضرور ہوجاتا ہے۔ عقل قدرت کا گرانقدر عطیہ ہے اور تاریخی زمانے میں انسان نے جو ترقی کی ہے سب عقل کی مرہون منت ہے مذہب کا کام عقل کی جگہ لینا ہے اسے معطل کرکے اس کے فرائض خود انجام دینا نہیں ہے بلکہ حقیقی مذہب ایمان کی قوت سے عقل کو

مستحکم کرتا اور اعتقاد کی آبیاری سے اس کے نشو ونما کو ممکن بناتا ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے علم میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ مسائل حاضرہ کو حل کرنے میں علم کے اس بیش بہا ذخیرہ سے کام نہ لینا گناہ کبیرہ ہے۔ مذہب سے وفاداری کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ سابقہ علماء اور فقہا کے مرتبہ قوانین اور ضوابط کو ہم اتنا واجب التعظیم اور واجب التعمیل قرار دیں کہ اجتہاد کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

مذکورہ بالا تصور اس نقطہ نظر کے منافی ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ چند دن ہوئے کہ ایک سرگرم مذہبی کارکن نے مجھ سے بیان کیا کہ مذہب کی سچائی کے بارے میں انہیں ایک تکلیف دہ شبہ پیدا ہوگیا ہے۔ ان کا مضبوط عقیدہ تھا کہ مذہبی قوانین کا ہر جگہ اور ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ضروری ہے۔ اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہوگا کہ جو لوگ قطب شمالی کے قریب رہتے ہیں۔ وہ کس طرح نماز و روزے کے قواعد کی پابندی کر سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مذہب کا ایک غلط ناقص تصور انہیں مذہب ہی سے برگشتہ کر رہا تھا۔

اس تصور کی رو سے مذہب ایک ایسا رہنما ہے جس کے ذمہ ایک اندھے بے عقل کمزور شخص کو منزل مقصود تک پہنچایا گیا ہے۔ رہنما اس شخص کو سہارا دے کر کھڑا کرتا' سنبھال کر لے چلتا' ہر قدم پر اسے ہدایت کرتا ہے کہ اب گڑھا آگیا ہے بازو سے چلو۔ اب ہموار زمین ہے تیز چل سکتے ہو۔ اب راہ میں کانٹے ہیں ذرا ہٹ جاؤ اب دائیں جانب مڑ جاؤ اب بائیں جانب۔

اس کا مقابلہ دوسرے تصور سے کیجئے۔ جس کی رو سے مذہب کی رہنمائی ایک عام نوعیت کی ہے۔ اس کی ہدایت اس شخص کے لئے ہے جو عقل و دانش سے بہرہ ور ہے۔ اور اس سے کام لینے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہے۔ مذہب انسان کی جدوجہد کے لئے ایک سمت متعین کرتا ہے اور ایک قطب نما مہیا کرتا ہے۔ جس سے اسے وقتاً فوقتاً پتہ چلتا رہے کہ اس کی مساعی کا رخ صحیح سمت میں ہے یا نہیں۔

اس تصور کے مطابق مذہب کی تلقین بس اتنی ہے کہ ہم ہر وقت خدا کی خوشنودی کو پیش نظر رکھیں۔ خدا کی موجودگی کا قوی احساس ہمارے قلوب پر طاری و ساری رہے۔ ہر موقع و محل پر ہم یہ سوال کریں کہ ہمارا عمل ہمیں بارگاہِ ایزدی سے قریب کرتا ہے یا دور۔ اگر ہمارے اعمال اس سمت میں ہوں اور اس معیار پر پورے اتریں تو مذہب کے حقیقی مطالبہ کی تشفی کریں گے۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن ۔۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقل اور علم کی روشنی میں انسان کو اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیئے۔ عقل رکھنے کی وجہ سے اس کو غلطی کرنے کا حق ہے اور راستے سے کبھی کبھی بھٹک جانے کی آزادی ہے۔مگر وہ صحیح سمت کا خیال رکھے تو غلطی سے ہی سبق حاصل کر سکتا ہے اور بھٹک جانے کے بعد پھر ٹھیک راستہ بھی پا سکتا ہے۔ وہ ضابطہ جو قدم قدم پر انسان کے عمل کو متعین کرے اس سے یہ قیمتی حق اور آزادی چھین لیتا ہے۔ اور کائنات کے لا متناہی امکانات کے پیش نظر ہر ممکنہ صورت حال کے بندوبست کی ضمانت بھی نہیں دے سکتا۔اسی لئے اگر ہم اس تصور کو اپنے قلوب میں جاگزیں کر لیں تو دینی فلاح اور دنیوی بہبود دونوں حاصل کر سکیں گے۔

ان الذّین قالو اربّنا الله ثم استقاموا . فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون .

(بین الاقوامی مذہبی کانفرنس میں پیش کردہ مقالہ)

مذہب میں ظاہر و باطن کا فرق اور ان کا باہمی تعلق

جب کبھی ہم مذہب کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر زیادہ تر اس کا ظاہری پہلو ہوتا ہے۔ جن چیزوں کا ہم اپنے خارجی حواس سے ادراک کرتے ہیں فطرتاً انھیں کو اہمیت بھی دیتے ہیں۔ اور عام آدمی کی نظر تو محسوسات سے آگے بڑھ کر لطیف حقائق تک شاذ ہی پہنچتی ہے۔ ہر مذہب کے راسخ العقیدہ پیرو ایک خاص ظاہری وضع قطع کے حامل اور ایک مخصوص ضابطہ کردار کے پابند ہوا کرتے ہیں' خارجی کردار کی مماثلت انھیں ایک دوسرے سے قریب کرتی اور ہم مشربی کے احساس کو تقویت دیتی ہے اور ساتھ ہی انھیں دوسرے مذاہب والوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ ان میں یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اپنی جماعت کے متعین کردہ اصول سے تجاوز کرنا محض ربطِ ملت کو توڑنا نہیں بلکہ مذہب سے انحراف کرنا ہے۔ ان کی نظر خارجی اعمال پر مرتکز ہو جاتی ہے اور کردار میں اپنے ہم مذہبوں سے توافق کو وہ غیر معمولی اہمیت دینے لگتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اتحادِ ملی کے استحکام کا باعث اور مفاد عامہ کے لئے قریبی اشتراک و تعاون کا ضامن ہوتا ہے۔ مگر اس مسلک میں دو سنگین خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کے جوشیلے پیرو اصل مذہب سے رفتہ رفتہ دور ہونے لگتے ہیں۔ پہلی خامی یہ ہے کہ زہد و اتقا کی ظاہری نمائش بہت سہل ہے اور سچے اور پختہ یقین کی عدم موجودگی میں ایک شخص آسانی سے اپنے اعمال وضع قطع میں احکام مذہبی کی ظاہری پابندی کر کے دوسروں کو فریب دے سکتا ہے اسی طرح منافقت اور ریاکاری کا راستہ کھل جاتا ہے اور اس کو اختیار کرنے کی طاقتور ترغیب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قرآن پاک میں یہودیوں کی اسی بناء پر بار بار مذمت کی گئی ہے کہ وہ مذہبی شعائر اور رسوم پر سختی سے کاربند رہنے کے باوجود مذہب کی اصلی غرض و غایت سے غافل اور بے پرواہیں۔ خیام' سعدی اور حافظ جن کے افکارِ عالیہ کا ہم سب احترام کرتے ہیں' مذہب کو ظاہری اعمال تک محدود کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ اس تصور کے تحت منافقوں اور ریاکاروں کو مذہبی زمرہ میں شامل ہونے کا آسانی سے موقع مل جاتا ہے اور اس قسم کے لوگ مذہب کو تقویت پہنچانے کے بجائے اس کی بیخ کنی کا باعث ہوتے ہیں دوسرا خطرہ جو

اس مسلک کے پیرووں کو درپیش ہوتا ہے اور بھی زیادہ مہیب ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ چند قواعد کی پابندی اور چند متعینہ اعمال کی بجا آوری مذہب کے مطالبات کے لئے کافی ہے۔ ان کے ذہن میں مذہب ایک خشک اور بے جان ضابطہ کردار بن کر رہ جاتا ہے۔ انھیں یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ مذہب کا ایک حقیقی حیات بخش سرچشمہ بھی ہے جو ان کی روحانی تشنگی کی تشفی کرسکتا ہے۔ احکام کی میکانکی تعمیل انھیں ذوق مذہبی سے محروم رکھتی ہے۔ اس لئے صوفیائے کرام نے زاہد ظاہر بین اور عابد خشک کو ہمیشہ بہ نظر ترحم و تاسف دیکھا ہے اور انھیں مذہب کے باطنی پہلو کی طرف متوجہ اور راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مسلک کے حامی باور کرتے ہیں کہ مذہب عبادت ہے۔ خاص وارداتِ قلبی، کیف و انبساط کے احوالِ شعوری اور عشق و محبت کے جذباتِ لطیف سے خصوصاً جب کہ وہ کائنات اور مرکز کائنات سے قریبی ربط و تعلق کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مذہب کے باطنی پہلو کو اہمیت دینے والے یہ ایقان رکھتے ہیں کہ حقیقی مذہب کائنات سے احساس یگانگت ہے اور وہ جذبہ عشق ہے جو اس احساس کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ اس مسلک کی بلندی و عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس میں بھی ایک خامی پائی جاتی ہے۔ ظاہری اعمال پر ہر ایک نظر پڑتی ہے اور ان کی تصدیق کرنا آسان ہے۔ مگر باطنی کیفیات کا علم اسی کو ہوتا ہے کہ جس پر وہ گزرتی ہے اور اسی لئے بہت سے ایسے ہیں جو اس اعلیٰ اور لطیف تجربہ کا دعویٰ کرتے ہیں اور حقیقت میں اس سے کوسوں دور ہیں۔ ایسے مدعی اپنے آپ کو عبادات و اعمال ظاہری سے بے نیاز سمجھنے لگتے ہیں اور ہم مذہبوں سے کرداری توافق کو خلافِ شان۔ ان کا راستہ نراجیت کی طرف لے جاتا ہے اور ان کی ہمت افزائی سے مذہبی تنظیم کے درہم برہم ہوجانے اور جماعت کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے، اسی بناء پر منصور حلاّج جیسے صوفیوں کو جو مذہب کے ظاہری پہلو کو قطعاً نظر انداز کرتے تھے علمائے دین کو مذہب کے لئے ایک عظیم خطرہ قرار دیا اور ان کے تخریبی اثر کو روکنے کے لئے حکومت کی امداد حاصل کی۔

حقیقت یہ ہے کہ ظاہری اور باطنی دونوں پہلو صحت مند مذہبی زندگی کے لئے ضروری ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں کے باہمی تعلق کی کیا نوعیت ہے اور ان میں توازن کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے؟ پہلے اس سوال کو سمجھتے ہوئے کہ ان میں کسی قسم کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

مذہب کا منبع ایک اعلیٰ، لطیف اور ناقابلِ اظہار نفسی تجربہ ہوتا ہے اس تجربہ کا ایک لازمی اور

لائنیفک پہلو خود اس کی اصلیت اور صداقت پر ایقان کامل ہوتا ہے۔

''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب' جن پر یہ تجربہ وارد ہوتا ہے وہ اس کے متعلق کسی شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہوتے۔ مگر اس ایقان کو دوسروں کے ذہن میں عقلی دلائل اور منطقی براہین سے منتقل کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے یہ ایقان اسی کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ جو اس سے بہرہ ور ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بانیانِ مذاہب کے اساسی تصورات کا سرچشمہ اسی قسم کا مگر اس سے بلند و برتر باطنی تجربہ ہوگا۔ ان کے علاوہ ہر زمانہ میں اور ہر مذہب میں ایسے صوفی اور مستکِ (Mystic) پائے جاتے ہیں۔

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم   آمیزشے کجا گہرِ پاکِ اُو کجا

ان میں سے بعض نے اس لطیف تجربہ کو الفاظ کی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے اگرچہ ہم ان مساعی کو بجا طور پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر ان کے بیانات میں بہت سے اختلافات کے باوجود کچھ مشترک باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن سے ان ناقابل بیان نفسی کیفیت پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تجربہ میں وقوفی پہلو نسبتاً کم اہم اور غیر متعین ہوتا ہے جب کہ جذباتی پہلو طاقتور اور شدید ہونے کی وجہ سے حالتِ نفسی پر غالب اور حاوی ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک زبردست ایقان اس تجربہ سے وابستہ ہوتا ہے کیونکہ جذباتی ردِّ عمل شک و ارتیاب اور تنقید و تفحص کے ذہنی اعمال کا مانع و مخالف ہے۔ اس تجربہ کا مرکزی حصہ کائنات کی لامحدودیت کا شدید احساس اور کائنات سے عشق و محبت کا قوی رابطہ ہوتا ہے بے خودی کی کیفیت اسی جذبہ اور احساس کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، اصل میں یہی تجربہ مذہب کا باطنی پہلو ہے، جس کی عدم موجودگی میں مذہب ایک خشک اور بے جان سی چیز ہے اب اس سوال پر غور کیجئے کہ اس باطنی تجربہ کا ان عقائد و اعمال سے کیا تعلق ہے جو مذہب کا لازمی جز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس تعلق کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس نفسیاتی حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر شدید جذبہ ایک طرف تو ایسے ذہنی تصورات پیدا کرتا ہے جو اس کے ہم آہنگ ہیں اور اس کو تقویت دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنے فطری رجحان سے ایسے حرکات و افعال میں ظاہر ہوتا ہے جو اس کی شدت میں گھٹاؤ پیدا کر کے اس کی تشفی کا باعث ہوتے ہیں۔ نفسِ انسانی کے وقوفی جذباتی اور ارادی اعمال ایک ایسی وحدتِ تامہ میں مربوط ہیں کہ کسی جذبہ کے برانگیختہ ہوتے ہی وقوفی و ارادی اعمال بھی اس کے ہمراہ گامزن ہونے پر مجبور ہیں۔ مذہبی تجربہ بنیادی طور پر ایک لطیف جذبہ ہے مگر وہ فطری طور

پر تصورات کی طرف رہبری کرتا ہے جو معتقدات کی شکل اختیار کرتے ہیں اور افعال میں ظاہر ہوتا ہے جو شعائر مذہبی قرار پاتے ہیں' مذہب کی اصل باطنی تجربہ ہے اور اس لئے وہی اعلیٰ ترین اہمیت کا حامل ہے، معتقدات اور اعمال اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ثانوی اور تحتانی اہمیت کے ہی مستحق ہیں۔ باطنی تجربہ کی حد تک تمام مستکِ اور صوفی خواہ وہ کسی ملک' کسی زمانہ اور کسی مذہب کے ہوں بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں اور آپس میں متفق ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تجربہ ملکی' ثقافتی اور تاریخی اثرات کی رسائی سے باہر ہوتا ہے۔ مگر یہ اثرات پوری قوت سے معتقدات اور اعمال کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک اور زبانوں کے صوفیوں میں بنیادی اتفاق تو پایا جاتا ہے مگر ساتھ ہی ان کے عقائد و اعمال شدید اختلافات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ اگر ہم مذہب کے باطنی تجربہ کو حقیقی اہمیت کا حامل تسلیم کریں اور عقائد و اعمال سے وابستگی کو اسی حد تک رکھیں جس کی عقلِ سلیم اجازت دیتی ہے تو مختلف مذاہب کے پیروؤں کے درمیان رواداری اور باہمی اشتراک و تعاون کا راستہ کھل جائے گا اور تعصبات مذہبی' انسانی اتحاد و ترقی کی راہ میں حائل نہیں رہیں گے۔ اس نقطہ نظر کے حامی یہ نہیں چاہتے کہ کسی مذہب کے پیرو اپنے مخصوص طریقوں کو ترک کر دیں اور اپنے مذہب کے اوامر و نواہی کو واجب التعمیل نہ سمجھیں۔ وہ صرف یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ظواہر میں اختلافات کو غیر ضروری طور پر اجاگر نہ کیا جائے اور ان کی وجہ سے مذہبی اندازِ ذہن رکھنے والوں کے بنیادی اتحاد کو طاقِ نسیان کی زینت نہ بنایا جائے۔ ان کا اتحاد اگر نہیں ہو سکتا تو صرف اس گروہ سے جو سرے سے خدا کے وجود کا ہی منکر ہے اور جو دعویٰ کرتا ہے کہ فطرتِ خارجی سے انسان کا ربط میکانکی تعلق سے بلند تر سطح پر ممکن ہی نہیں اور نفس انسانی عضوی و احساسی تجربہ کے علاوہ اور کسی لطیف تجربہ کی استعداد نہیں رکھتا۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ موجودہ زمانہ میں یہ زمرہ کافی وسیع اور طاقتور ہے اور اس کے عزائم جارحانہ طور پر توسیع پسند ہیں۔ کسی مذہبی زاویہ نگاہ کے حامی اس گروہ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر کے ان اقدارِ عالیہ کی جو انھیں عزیز ہیں صیانت و تحفظ کے لئے موثر اقدام کر سکتے ہیں۔ سطور بالا میں تجربہ لدنی یا مسٹیکل اکسپیرینس (Mystic Experiance) کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہم سے اکثر اس سے براہ راست ذاتی واقفیت نہیں رکھتے اور نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صوفی کہتے ہیں کہ اس تجربہ کی لذت کا وہی شخص صحیح اندازہ کر سکتا ہے جو اس سے متلذذ ہو چکا ہو۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

بہر حال اس سے پست سطح پر مگر اسی قسم کا ایک تجربہ ہے جو عام انسانوں کی رسائی سے باہر نہیں ہے دونوں میں درجہ کا فرق ہے نوعیت کا نہیں۔ اس تجربہ میں عام انسان گھٹیا ذاتی اغراض کے تنگ وتاریک زنداں سے رہائی پاکر کائنات کی روح پرور فضائے بسیط سے کیف وانبساط اور آزادی مطلق حاصل کرسکتا ہے۔ مشہور جرمن افسانہ نگار اور مفکر کیتلر نے اس کیفیت نفسی کو اوشیانک سنس (Occeanic sense) یا ''احساس بے کرانی'' کا نام دیا ہے۔ کیتلر کا بیان ہے کہ دریچۂ زنداں سے نیلگوں آسماں کے نظارے نے یہ کیفیت اس پر طاری کی حقیقی مستیکی تجربہ سے بعض برگزیدہ ہستیاں ہی فیض یاب ہوسکتی ہیں مگر احساس بیکرانی ہر شخص کی دسترس میں ہے بشرطیکہ وہ کچھ دیر کے لئے عام دلچسپیوں اور ادنیٰ اغراضِ ذاتی سے کنارہ کش ہوسکے اور مناسب اندازِ ذہنی اختیار کرسکے۔ قدرت کے تمام حسین مناظر اس احساس کی تحریک کا باعث ہوسکتے ہیں خصوصاً رات کی پرعظمت تاریکی، صبح کی روح پرور تازگی، شفق کی دلفریب رنگینی اور آسمان کی پرشوکت رفعت ووسعت اس قسم کے احساس کو برانگیختہ کرتے اور نفسِ انسانی کو ماورائی حقیقت سے روشناس کرتے ہیں۔ جو شخص احساس بیکرانی کا ذوق رکھتا ہے اس پر قرآن پاک کی آیت **فاینما تولوا فثمّ وجه الله** (البقرہ آیت ۱۱۵) کے معنی منکشف ہوتے ہیں اور وہ حافظ کا ہم زبان ہوکر کہتا ہے۔

بہر نظریت ما جلوہ می کند لیکن کس آں کرشمہ نہ بیند کہ من ھمی نگرم

اسلام کی اساسی تعلیم

ہر زمانے میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مذہب کے تقاضوں پر نئے زاویہ سے غور کیا جائے اس کی چھان بین کی جائے۔ اور اسے اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذیب کی بنیادی تعلیم ہی بدلتی رہتی ہے۔ اور تغیر کو اس میں بھی دخل ہے۔ انسانی زندگی کا ماحول بدلتا رہتا ہے۔ اور اس کے لحاظ سے انسان کی احتیاجات اور خواہشات بھی بدلنا ضروری ہے مگر فطرت انسانی کے بعض عناصر مستقل نوعیت بھی رکھتے ہیں۔ مسرت کی خواہش' کائنات سے ربط وہم آہنگی کی جستجو' زندگی کے دوام اور تسلسل کی خواہش آج کل کے انسانوں میں بھی ویسے ہی قوی ہیں جیسے صدیوں پہلے کے انسانوں میں تھیں اور جب تک انسان' انسان ہیں یہ خواہش اس کی فطرت کا لازمہ رہیں گی۔ مذہب کی بنیادی تعلیم کا تعلق انسان کی فطرت کے ان ہی مستقل غیر متغیر پہلوؤں سے ہے پھر بھی زندگی ساکن نہیں انسان کا علم اور تجربہ ترقی کرتے جارہے ہیں نئے علم و دانش کے ساتھ مذہبی تعلیم پر بھی از سر نو غور کرنا اور اس کی بہتر تعبیر کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی تعلیم میں مرور زمانہ کے ساتھ بہت سی نئی چیزیں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ وقتی ضروریات کے تقاضہ سے اس میں بہت سے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف خیالات' تصورات' معتقدات' توہمات رسم ورواج اس سے وابستہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان نئے اضافوں کی کثرت سے بنیادی تعلیم ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اصول وفروغ میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اور لوگ ان زوائد ولواحق کو بھی اساسی تعلیم کے برابر سمجھنے لگتے ہیں۔ مذاہب کے اختلافات زیادہ تر فروعی اور غیر اہم امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام اعلیٰ مذاہب کی تعلیم بنیادی طور پر نمایاں یکسانیت رکھتی ہے ان مشترک اصول وعقائد کو اجاگر کرنے سے مذہب کے اتحاد کا راستہ نکل جاتا ہے مذہب میں اس قسم کا نظری وعملی اتحاد اس زمانے کی ایک شدید ضرورت ہے بے دینی اور لامذہبیت کی تحریک دنیا کے بڑے حصہ میں روز بروز قوی ہوتی جارہی ہے۔ اس کا مقابلہ اور صحیح مذہبی تعلیم کی کامیاب ''مدافعت'' مذاہب کا متحدہ محاذ ہی کرسکتا ہے۔ اسلام کی اساسی تعلیم کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ ادق ومشکل نہیں۔ وہ ایسی سلیس اور صاف ہے کہ ہر شخص بہ آسانی

اسے سمجھ سکتا اور اس پر کار بند ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الدّین یسر (دین آسان ہے)۔

اس تعلیم کا پہلا اہم رکن خدا پر ایمان ہے۔ خدا پر ایمان سے مطلب ایسی بلند و برتر ہستی کو ماننا ہے۔ جو قادر مطلق بھی ہے۔ اور نیکی کا سر چشمہ بھی۔ ایمان محض خدا کے وجود کا عقلی اقرار نہیں۔ ایمان ایسا فعل ہے جو انسان کی خودی کے تمام پہلوؤں کا آئینہ دار ہو۔ ایمان میں جذباتی پہلو شامل ہے۔ اس کا اہم عنصر خدا سے محبت کا تعلق ہے۔ ارادی پہلو ایمان میں اس طرح شامل ہوتا ہے کہ انسان خدا سے قربت اور نزدیکی کا خواہشمند ہو۔ نہ صرف خواہشمند ہو بلکہ بارگاہ خداوندی سے قربت حاصل کرنے کے لئے مسلسل جدو جہد میں مصروف و مشغول ہو۔ صوفیاء کرام نے ایمان کے جذباتی اور ارادی پہلوؤں پر خاص طور پر زور دیا ہے اور ایمان کو عشق حقیقی سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا روم کی رائے میں عشق حقیقی ہی تمام امراض روحانی کا واحد علاج ہے۔

اے طبیب جملہ علتہائے ما

مخلوق سے محبت

خالق سے محبت مخلوق کی محبت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور یہ اسلامی تعلیم کا دوسرا اہم رکن ہے۔ قرآن پاک میں انسانوں سے محبت اور ان کی خدمت کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ عمل صالح جس پر اصرار کیا گیا ہے۔ ایسے اعمال سے عبارت ہے۔ جس سے دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچے۔ اور ان کی بھلائی ہو۔ خدمت خلق کو انسانی تعلیم میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ خدمت خلق محض احساس فرض کے تحت نہیں ہونی چاہئیے۔ بلکہ اس کا محرک بے غرض محبت ہونا چاہئیے خالص اور بے لوث محبت سے جو خدمت کی جاتی ہے وہی اسلام کی نظر میں قابل قدر ہو سکتی ہے۔

باحسان آسودہ کردن دلے   بہ از الف رکعت بہر منزلے

قرآن پاک میں احسان کرنے کی تاکید اور احسان جتانے کی مذمت کی گئی ہے۔ جس طرح انسانوں سے محبت کرنا اور حسن سلوک سے پیش آنا بہترین نیکی ہے اسی طرح بدترین گناہ مردم آزاری اور انسان کے دل کو دکھ پہنچانا ہے۔ خدا ہماری خدمت کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی خدمت اس کے بندوں کی خدمت کرنے سے ہی کی جا سکتی ہے۔ سورہ عصر میں اسلامی تعلیم کے ان دو اجزاء کو صاف اور صریح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ

تمام انسان گھاٹے میں ہیں بجز ان کے جو خدا پر ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کا التزام کرتے ہیں۔

غیب پر ایمان

اسلامی تعلیم کا تیسرا اہم رکن غیب پر ایمان ہے اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی ابتداء ہی میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب صرف ان کے لئے ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ عام معنی میں غیب سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔ مگر خاص معنی میں غیب کائنات کی ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کا ادراک ہم اپنے حواس سے نہیں کر سکتے۔ عالم محسوسات سے پرے کا عالم، عالم غیب ہے۔ غیب پر ایمان مذہب کے لئے لازمی ہے۔ اور اسی لئے ہر مذہب میں اُس کو کسی نہ کسی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان حقائق سے جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں ربط و تعلق پیدا کرنا ہی مذہب ہے۔ غیب پر ایمان محض ایک وہم نہیں اور نہ وہ کسی ادنیٰ ذہنی قوت کی پیداوار ہے۔ وہ ذہن کے ارتقاء کی اعلیٰ منزل پر ہی ممکن ہوتا ہے۔ جانور کے لئے حال ہی اصل حقیقت ہے اس کا ذہن حال کے لمحہ میں مقید ہوتا ہے۔ ماضی اور مستقبل اس کے لئے کوئی وجود نہیں رکھتے موجودہ وقت کے حدود سے اس کی نظر آگے نہیں جا سکتی انسانی ذہن نے یہ دیواریں توڑ دی ہیں۔ اور اس لئے ماضی اور مستقبل کی وسعتیں اس کی نظر کے لئے کھل گئی ہیں، اس کا عمل محض موجودہ حالات کا تابع نہیں ہوتا۔ بلکہ ماضی کا تجربہ اور آئندہ کے امکانات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان دو ذہنی قوتیں رکھتا ہے جن کی وجہ سے ازل اور ابد کی سمتیں اُس کے لئے کھل جاتی ہیں۔ قوت حافظہ ماضی کا دروازہ کھول دیتی ہیں اور قوت تصور آئندہ زمانے پر سے پردہ اٹھا دیتی ہے اسی لئے انسانی زندگی جانور کی بہ نسبت بامعنی اور بامقصد ہوتی ہے۔ لیکن انسان اسی منزل پر قانع نہیں رہ سکتا۔ اس کی روح نئی جولانگاہیں تلاش کرتی رہتی ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پایا

انسانی زندگی کا قوی ترین محرک تلاش معنی ہے۔ جب تک اپنی زندگی مکمل طور پر بامعنی نہ بنا لے انسان کو چین نہیں آتا۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان کائنات میں اپنے مقام کا تعین کر لے۔ اور اپنی زندگی کا کائناتی عمل سے رشتہ دریافت کر لے۔ عقل انسانی اس وقت تک راز حیات کے انکشاف میں ناکام رہی ہے اور مستقبل قریب میں توقع نہیں کہ وہ پوری کامیابی حاصل کر لے۔ سائنس باوجود زمانہ حال کی عظیم الشان ترقی کے زندگی کے آغاز و انجام، مقصد و معنی پر بہت کم

روشنی ڈال سکا ہے۔اس لئے صرف دو متبادل صورتیں ہیں جن میں ہم کو اختیار ہے کہ جسے چاہیں قبول کرلیں۔یا تو عقل پر اعتماد مطلق رکھتے ہوئے انسانی زندگی کو شیرازہ کائنات سے الگ ایک منفرد جزوِ لایعنی غیر اہم واقعہ تسلیم کرلیں یا مذہب اور ایمان کی مدد سے ان حدود سے آگے بڑھ جائیں جہاں تک عقل ہمیں پہنچاتی ہے۔اور ایک کل کو جو ہماری نظروں سے غائب ہے تسلیم کرلیں اور اپنی زندگی کو اس کل کے حرکی حیثیت دے کر بامعنی اور تشفی بخش بنائیں۔غیب پر ایمان سے لامحدود وسعتیں ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ارتقاء کی لامتناہی منزلیں روح انسانی کو دعوت عمل دینے لگتی ہیں وعدۂ خداوندی کہ ''ہم تمہیں درجہ بدرجہ بڑھاتے' ترقی دیتے جائیں گے'' انسان کی خوابیدہ عملی قوتوں کو بیدار کردیتا ہے۔اور نیکی کی راہ پر اسے سبک سرگرم رو بنادیتا ہے۔عمل صالح کو اگر اسی زندگی کے حدود میں دیکھیں تو بسا اوقات بے نتیجہ مہمل نظر آتا ہے۔اور اس کی تائید میں کوئی قطعی دلیل دستیاب نہیں ہوتی۔اس کی اہمیت اسی وقت واضح ہوتی ہے جب ہم زندگی کو موت پر ختم ہونا نہیں بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہوا باور کریں۔

اس وقت میرا مقصد اسلامی تعلیم کی ایک مکمل تصویر پیش کرنا نہیں ہے اس کے لئے میں نہ وقت رکھتا ہوں۔نہ ضروری قابلیت۔اس تعلیم کے جو اجزاء بیان کئے گئے ہیں وہ میری نظر میں خاص اہمیت کے حامل ہیں ایک ہمہ گیر تسلسل میں اور بھی اصول بیان کئے جاسکتے ہیں لیکن ان چند سطور کا مقصد اس تعلیم کی اہمیت اور اس پر توجہ مرتکز کرنے کی ضرورت واضح کرنا ہے۔امتداد زمانے کے ساتھ اس مرکزی تعلیم پر بہت سے اضافے کئے گئے ہیں۔یا اس سے اور ذیلی اصول مستنبط کئے گئے ہیں۔ان اضافوں میں بعض اصلی تعلیم کے عین مطابق اور اس لحاظ سے قابل قدر ہیں۔مگر کئی بالکل غیر متعلق ہیں۔اور بہت سے اس تعلیم کے سراسر منافی بھی ہیں مسلمانوں کے زوال کا سبب زیادہ تر یہی ہے۔کہ ان کی توجہ اصلی تعلیم سے ہٹ گئی۔اور لواحق وزائد سے وابستہ ہوگئی۔وہ تفصیلات اور جزئیات کے جال میں پھنس گئے۔اور بنیادی اصول بھولتے گئے۔ذیلی امور کو اہمیت دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ذہن انہیں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔اور اصلی تلقین کے نقوش مدھم پڑ جاتے اور مٹتے جاتے ہیں۔ذیلی امور سے غیر ضروری اہمیت منسوب کرنے کا نتیجہ تنگ دلی تنگ نظری اور عدم رواداری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں مسلمان کشادہ دلی' وسعت نظر اور رواداری کے لئے مشہور تھے۔

اوران ہی صفات کی وجہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کے گرویدہ بنانے میں کامیاب ہوئے تھے۔آج حالت اس کے برعکس ہے۔معمولی اختلافات کو اچھالنا' ذراسی بات پر دست وگریباں ہوجانا نئے نئے اختلافات پیدا کرنا ہمارا شعار ہوگیا ہے۔ابھی چندروز قبل آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔احمد آباد میں دو اسلامی تحریکات کے علمبردار سرگرم عمل تھے۔ان کے اختلاف رائے نے جو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔کسی بہت ہی حقیر بات پر ہوگا۔اس قدر شدت اختیار کی کہ نقضِ امن کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔اور حکام کو مجبوراً ان مذہبی رہنماؤں کو شہر سے باہر کرنا پڑا۔کیا ایسے بدنما جھگڑوں سے مذہب کی خدمت ہوتی ہے۔اور کیا اسلام کی عزت غیر مسلموں کی نظر میں بڑھتی ہے۔سعدی نے ایسے مقتداؤں کی نسبت کہا تھا کہ۔

اگر ازہر دو جانب جاہلا نند اگر زنجیر باشد بکسلا نند

بعض مذہبی پیشواؤں کے طرز عمل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اس مرض کا یہی علاج ہے کہ ہم اصل تعلیم کو ذہن نشین کریں۔اس پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔اور جزئیات کو ان کے مناسب مقام سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔

متحدہ محاذ

جس اساسی تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی تعلیم ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف قوموں کو خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں نے پہنچائی ہے۔کہا گیا ہے کہ سابقہ پیغمبروں نے جو تعلیم دی تھی۔قرآن مجید اس کی تصدیق اور توثیق کرتا ہے۔یہی اس تعلیم کی صداقت کی قوی ترین دلیل ہے۔جب تک فطرت انسانی کی موجودہ ہیئت باقی رہے اور اس میں کوئی ایسا انقلاب نہ آجائے کہ انسان انسان ہی نہ رہے۔اس تعلیم کی افادیت اور اہمیت میں کسی کمی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔یہی امر مختلف مذاہب کے اتحاد کے لئے شاندار مستقبل پیش کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مرتبہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہوجانے کی پرخلوص دعوت دی تھی۔یہ مشترکہ پلیٹ فارم اسی اساسی تعلیم پر مشتمل ہے۔مذاہب میں اختلافات بھی ہیں۔مگر یہ ذیلی نوعیت رکھتے ہیں۔بنیادی امور پر اتفاق موجود ہے یا

تحقیق وتفحص سے اس کا حصول ممکن ہے بہترین مثال خود آنحضرت گا اسوہ حسنہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ ضرورت خاص طور پر شدید ہوگئی ہے مذاہب' زندگی کے اعلیٰ ترین اقدار کی حمایت اور حفاظت کرتے ہیں جن میں اہم ترین قدر انسانی آزادی ہے موجودہ زمانہ میں دنیا کے ایک بڑے حصہ پر ایسی تحریک کا غلبہ ہے جو ان اقدار سے سرے سے انکار کرتی ہے۔ اور انسان سے اس کا بیش بہا اثاثہ یعنی آزادی سلب کر کے اسے ایک مشین کا پرزہ بنا دینا چاہتی ہے۔ اس تحریک کو بعض وجوہ سے روز بروز فروغ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا کامیاب مقابلہ صرف مذاہب کا متحدہ محاذ ہی کر سکتا ہے۔ اور انسانیت کے لئے اس عظیم خطرہ کو سب اعلیٰ مذاہب مل کر ہی دفع کر سکتے ہیں۔ جزئیات پر زور دینے اور توجہ مرتکز کرنے سے ایسا متحدہ محاذ کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اور اس صورت میں قوی اندیشہ ہے کہ لادینی اور لا مذہبیت کی تحریک ہر جگہ غالب آجائے گی۔ اور اس کے نتیجہ میں انسان اپنے اعلیٰ مرتبہ سے دستکش ہو کر ایک بے جان مادی مشین کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ یہ انسان کے لئے ایک دردناک حزنیہ ہے۔

اسلام کے مبلغین بھی اگر اسی اساسی تعلیم کو پیش کریں تو کثیر تعداد میں لوگ ہیں جو اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ اور اگر وہ ان تمام تصورات و معتقدات کے طومار کو جو اس سے عارضی طور پر وابستہ ہو گیا ہے پیش کر کے اصرار کرتے رہیں گے تو یہ اسلام کی بدخدمتی ہوگی۔ اور بجائے اسلام کی عزت بڑھانے کے گھٹا دیں گے۔

اس سلسلہ میں عقل اور ایمان کے تعلق کو صحیح طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ یہ غلط ہے کہ ان میں کوئی بنیادی تضاد ہے۔ انسانی زندگی میں دونوں کا ایک مناسب مقام ہے۔ کسی کو دوسرے کے مقام پر تصرف کا حق نہیں۔ عقل ہمیں جہاں تک لے جاسکتی ہے۔ ہمیں اس کی رہبری میں چلنا چاہیئے۔ مگر جب وہ اپنی جائز حد کو پہنچ جائے تو ایمان کو اس کی تکمیل کا فرض انجام دینا چاہیئے۔ بجائے عقل کی حد سے آگے ہر قسم کے وجود سے انکار کرنے کے ہمیں صحیح وجدان سے کام لے کر ایسے حقائق پر ایمان لانا چاہیئے جو ہماری نظر سے غائب ہیں، مگر ہماری فطرت کے اعلیٰ ترین محرکات اور مطالبات کے مطابق ہیں۔ اس طرح زندگی کی توقیر اور تکمیل کی صورت نکل سکتی ہے۔ انسان کو عقل اور ایمان دونوں کی ضرورت ہے۔ عقل بغیر ایمان کے انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور ایمان بغیر عقل کے ایک ایسا بیج ہے جو زمین شور پر ڈال دیا گیا۔ اور کبھی اگتا پھلتا پھولتا نہیں۔

جس اساسی تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ماخذ اور منبع قرآن پاک ہے جہاں تک ہو سکے ہمارا فرض ہے کہ زندگی کے اہم مسائل میں انہی کی طرف رجوع کریں۔ اور ہدایت و رہبری اسی سے حاصل کریں۔

آمیز شے کجا' گہر پاک اُوکجا
از تاک بادہ گیرم و درساغر افگنم

اجلاس دوم بین الاقوامی مذہبی کانفرنس منعقدہ ۱۸ر جنوری ۵۹ء (بصدارت حضرت مولانا سید شاہ عبدالرزاق صاحب قادری الموسوی جعفر پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

اسلام میں عبادت کا تصور

عام طور پر عبادت کا لفظ' ورشپ' پوجا اور پرستش کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ان الفاظ کے معنوی تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت کا تصور وسیع اور عمیق تر ہے۔ پوجا اور پرستش میں برتر ہستی کی تعظیم تکریم' احترام اور ان کی بے انتہا بلندی کے احساسات شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ پرستندہ کی بے انتہا پستی اور فرد مائیگی کا احساس بھی وابستہ ہوتا ہے' پرستندہ کی ذہنی حالت مطلقاً انفعالی ہوتی ہے عبادت میں علاوہ مذکور احساسات کے ایک ارادی عنصر بھی شامل ہے۔ اس ایک اہم اضافہ سے ذہنی حالت کی قلب ماہیت ہوجاتی ہے۔ پرستندہ کی ذہنی حالت انفعالی ہے۔ اس کے برخلاف عبادت گزار کی نفسی کیفیت حرکی' فاعلی اور آمادہ بکار ہوتی ہے۔ پرستندہ صرف محصّل ہے۔ عبادت گزار محصّل کے ساتھ موثر بھی ہوتا ہے۔ اس حرکی عنصر پر لفظ عبادت دلالت کرتا ہے۔ عبادت کے معنی خدمت اور خدمت کے معنی ایسا کام انجام دینا جو آقا کی مرضی کے عین مطابق ہو اور جس سے اس کے مقصد کی پیش رفت ممکن ہو۔ کام انجام دینے کے لئے قوت' محنت' سعی اور جدوجہد لازمی ہیں۔ جانفشانی اور عرق ریزی کے بغیر عبادت ممکن نہیں' پرستش ہوسکتی ہے۔ پرستش کے لئے گوشۂ تنہائی موزوں ہے' لیکن عبادت کے لئے میدانِ عمل کارزار حیات ہے۔

اگر عبادت کا عنصر غالب خدمت اور سرگرم خدمت ہے تو یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ کس معنی میں خدا کی خدمت کی جاسکتی ہے ظاہر ہے کہ خدا کسی خدمت کا محتاج نہیں۔ اِنّ اللہ غنیّ حمید عبادت کے ضمن میں خدمت سے مراد وہی کام ہوسکتے ہیں جو خدا کی مرضی ومنشا اور مقصد کے مطابق ہوں اور جن سے اس کی مخلوق مستفید ہو۔

کائنات خدا کی مخلوق ہے اور ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ اسے بے مقصد نہ سمجھیں ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا باطلاً''۔

(جو اعمال کائناتی مقصد کے ہم آہنگ ہوں اور اس کی تکمیل میں ممد ومعاون ہوں ان پر عبادت کا اطلاق

ہوسکتا ہے۔) کائناتی مقصد فہم انسانی کی رسائی سے باہر ہے لیکن عالم محسوسات میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن پر غور وخوص سے ہم اس کا مبہم ساخا کہ ذہن میں قائم کر سکتے ہیں۔ (اِنَّ فِی ذٰلِکَ لآیات)

مفکرین اور عارفین نے انہیں ارشادات کی رہنمائی سے کائناتی مقصد کے خط وخال کا قیاس کیا ہے۔ کاروانِ حیات ہدایت الٰہی کے تحت اعلیٰ اقدار حق وصداقت، حسن و جمال کے تحقق اور بالخصوص انسانی معاشرہ میں ان کی روز افزوں ضیا پاشی کی سمت میں بڑھتا معلوم ہوتا ہے۔

مشیت ایزدی یہ ہے کہ ذی شعور انسانوں کے آزادانہ تعاون سے یہ کاروان اپنی بلند منزل مقصود کو پہنچے ہر وہ عمل جو اس مقصد کی تکمیل میں معاون ہو اور بنی نوع انسان کو منزل مقصود سے قریب کرے عبادت ہے، بنی نوع انسان کی یہی صحیح اور حقیقی خدمت ہے اور چونکہ وہ مشیتِ ایزدی کے ہم آہنگ ہے اس لحاظ سے خدا کی خدمت ہے، خدا کی خدمت یا عبادت ہم اسی طرح انجام دے سکتے ہیں کہ اس کے متعین کردہ مقصد کے حصول کے لئے اس کی عطا کردہ قوتوں کو استعمال کریں اور انسانی معاشرہ میں اعلیٰ اقدار کی تکثیر وتوقیر کے لئے مسلسل جدوجہد میں مصروف رہیں۔ اعلیٰ اقدار کا ظہور اسی وقت ممکن ہے کہ انسان کی ذات اور معاشرہ دونوں میں مضبوط اتحاد اور کامل ہم آہنگی موجود ہو۔ اسلامی تعلیم میں توحید کو مرکزی مقام حاصل ہے اگر توحید پر عقیدہ راسخ ہے تو اس کے اثرات کا انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ظاہر ہونا لازمی ہے۔ اگر عقیدۂ توحید دل میں جاگزیں ہے تو خدا کی وحدت انسان کی ذات اور اس کے معاشرہ پر تو افگن ہونا ضروری ہے۔ جو شخص توحید کا قائل ہے وہ لازماً انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے ان میں اتحاد، ہم آہنگی اور یگانگت کو فروغ دینے کی کوشش پیہم کرتا رہے گا۔ جو شخص فروعات پر چاہے وہ دینیاتی ہوں یا سیاسی، اختلافات کو ہوا دیتا ہے اور معاشرہ کو منقسم اور پراگندہ کرتا ہے وہ دراصل شرک کی خدمت میں مصروف ہے۔

ہر وہ عمل عبادت ہے جو قوم میں یک جہتی کو فروغ دے اور اتحاد کو تقویت بخشے، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْ بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ (حجرات ۱۰)

(ترجمہ: مومن تو آپس میں بھائی بھی ہیں پس اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ)

مزید ہدایت کی گئی ہے کہ اَقِیْمُو الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْ افِیْہِ (ترجمہ: قائم کرو دین کو اور آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ)۔ قرآن صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ جملہ انسانوں کو چند اساسی اصول پر متحد اور متفق ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن نے انسان کے لئے جس منزل کا تعین کیا ہے وہ ایک

واحد ہمہ گیر معاشرہ کی تشکیل وقیام ہے۔اعلیٰ اقدار کی مسلسل توفیر ایسے ہی عالمگیر معاشرہ میں ممکن ہے ہر وہ عملی قدم جو اس سمت میں اٹھایا جائے حقیقی عبادت ہے۔

اس ضمن میں اس فرق وامتیاز کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو عبادت اور ریاضت کے مابین پایا جاتا ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ کچھ عرصہ سے اس امتیاز کو نظر انداز کرنے کا رجحان عام ہوگیا ہے اور ریاضت پر اکتفا کیا جانے لگا ہے۔

عبادت کائناتی مقصد کے حصول میں براہ راست موثر حصّہ لیتی ہے اور ریاضت بالواسطہ طور پر۔ ریاضت کا مقصد انسان میں عبادت کی اہلیت اور صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ صحیح طور پر عبادت انجام دینے کے لئے ضبطِ نفس اور خدا سے ربط کا شدید احساس ضروری ہے ریاضت ان ہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ریاضت سے خودی مستحکم ہوتی ہے اور رجوع الی اللہ کا ذہنی انداز قائم ہوتا ہے اور انسان میں حقیقی عبادت انجام دینے کی قابلیت اور آمادگی رونما ہوتی ہے۔ ریاضت کا کام عبادت کے لئے تیار کرنا ہے۔ ریاضت عبادت کا پہلا زینہ ہے۔ اسی زینہ پر ٹھہر جانے سے اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص فن جنگ کی محنت شاقہ سے تحصیل کرے مگر عمر بھر میدان جنگ سے گریز کرتا رہے۔ اسی بناء پر قدیم شعراء اور صوفیائے کرام' زاہد مرتاض کو ہدفِ ملامت بتاتے اور اس کی توجہ حقیقی عبادت کی جانب منعطف کرنے کی کوشش کرتے رہے' آج اگر ہم اپنی قوتِ عمل کو بیدار کرنا چاہتے ہیں تو ریاضت کو مناسب حد تک رکھ کر عبادت پر توجہ مرتکز کرنا ضروری ہے۔

عبادت کے تعلق سے ایک اور بات قابل غور ہے ہر زمانے میں وہی بہترین عبادت ہے جو اس زمانے کے حالات کے مطابق ہو اور جو برائی اس وقت معاشرہ میں سرائیت کی ہوئی ہو اس کا موثر طور پر انسداد کرسکے۔ عبادت کی نوعیت بھی زمانے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ خدمت وہی اچھی ہے۔ جو انسان کی واقعی ضرورت کو پورا کرے۔ موجودہ زمانے میں ہمارے معاشرہ کی سب سے شدید ضرورت اتحاد کی ہے' قوم متعدد سیاسی اور مذہبی گروہوں میں منقسم ہوگئی ہے۔ یہ گروہ آپس میں متصادم نہ بھی ہوں تو ان میں اتحاد عمل تو ضرور مفقود ہے۔ اس لئے کسی مقصد کے حصول کے لئے قومی قوت مجتمع نہیں کی جاسکتی۔ مرکز گریز قوتیں پورے زور پر ہیں کوئی بیرونی مبصر آتا ہے تو اس کی نظر پہلے مسلمانوں کے انتشار پر پڑتی ہے۔ یہ حالات ہم سے ایسے عمل کا تقاضا کرتے ہیں جس سے مرکز جُو قوتوں کو تقویت ہو اور قوم میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا ہو اچھے مقصد کے لئے سب مسلمان متحد طور پر کوشش کریں اور

کسی فرد یا گروہ کی سرگرمی قوم کے لئے مضرت رساں ہے تو کم از کم اس سے تعاون نہ کریں۔
وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَاتَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

اس انتشار کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم خدا کو چھوڑ کر حرص و ہوا کا دامن تھام لیتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والے پراگندہ اور منتشر رہیں۔ **واقیمو الدین ولا تتفر قوافیه**

اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ غرض کے بندوں کا بھی ایک دوسرے سے متصادم ہونا لازمی ہے۔

مردانِ خدا گرچہ ہزار اند یکے اند　　مردانِ ہوا گر چہ یگانست دو گانست

اس دور ابتلاء میں بہترین عبادت اتحاد ملی کے قیام اور استحکام کے لئے سعی پیہم ہے۔ آخری تحلیل میں عبادت کے دو بنیادی عناصر کا پتہ چلتا ہے یہ دونوں عبادت کے اجزائے لاینفک ہیں۔

کسی فعل کی قدر جانچنے کے لئے ہم اسی معیار سے کام لے سکتے ہیں۔ ایک آیت قرآنی میں ان کی صراحت کی گئی ہے۔

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَاِلَى اللّٰه عَاقِبَةُ الاُمُوْرِ (سورہ لقمان آیت ۱۳)

(ترجمہ: جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور عملاً وہ نیک ہو تو اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا' اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے)

جس عمل میں تسلیم و احسان کا امتزاج ہو وہی عبادت افضل ترین عبادت ہے اپنی خواہشات اور ارادوں کو مشیت ایزدی کے ہم آہنگ اور تابع کر کے ہم دوسرے انسانوں کی فلاح و بہبود میں اضافہ کرتے رہیں تو ہم نے **عروۃ الوثقٰی** کو تھام لیا اور عبادت کے مغز کو حاصل کر لیا۔ ایک قدیم مقولہ ہے کہ

"عبادت بجز خدمت خلق نیست"

یہ صداقت پر مبنی ہے لیکن صداقت کلی کو نہیں ظاہر کرتا۔ صرف خدمت خلق عبادت نہیں خدمتِ خلق اسی وقت عبادت کا روپ اختیار کرتی ہے جب وہ خدا سے ربط اور اس کی مشیت کی متابعت سے وابستہ ہو، عصرِ جدید کے حقائق کو تسلیم کرنا اور اپنے عمل کو ان کے مطابق بنانا ہمارا فرض ہے۔ ان

حقائق سے انکار شیوۂ تسلیم کے مغائر ہے۔ اگر حقائق ہم سے اپنے رسم ورواج طور وطریق میں ضروری تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمیں ایسی تبدیلی اجماع کے ذریعہ لا کر ضروری اوراہم تقاضوں کے مطابق اور ہم آہنگ بنانا چاہئیے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق زمانہ کو مشیتِ ایزدی کا مظہر سمجھیں اور ان سے سرتابی نہ کریں۔ حقائق سے روگردانی کی ہم بھاری قیمت دے چکے ہیں زمانے کے دھارے کے خلاف جدو جہد کوشش بیہودہ اور ضعفِ ایمان کا نتیجہ ہے۔

عبادت میں خدمت کے ساتھ اطاعت اور فرمانبرداری بھی شامل ہیں۔

❀❀❀

اسلام۔دین اور ثقافت

ثقافت قوم کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتی ہے۔ ہر صفت' ہنر اور قابلیت' علم وفن' رسم و رواج' شعائر اور ادارے جو اجتماعی زندگی میں اکتساب کئے گئے ہیں ثقافت میں شامل ہیں' مذہب ثقافت کا ایک اہم جز ہے۔ بلکہ مذہب کو ثقافت میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ مذہب ثقافت کے باقی تمام اجزاء کو متاثر کرتا اور ان کے ارتقا کی سمت متعین کرتا ہے۔ اگر مذہب' ثقافت میں مرکزی مقام رکھتا ہے تو مذہب کا مرکزی عنصر دین ہے۔ دین وہ حرکی اور تخلیقی قوت ہے' جس سے مذہب نشو ونما پاتا اور حیاتِ تازہ حاصل کرتا رہتا ہے۔ مذہب ایک سماجی ادارہ ہے۔ اور دوسرے اداروں کی طرح مرورِ زمانہ سے اس میں تغیر وتبدل' ترمیم واصلاح رونما ہوتے رہتے ہیں مگر مذہب کا سرچشمہ اور منبع دین' حوادث سے غیر متاثر ایک ابدی حقیقت ہے۔ اگر اسلام سے مراد ہم وہ دین لیں جس کا وہ حامل تھا تو اس حد تک وہ بھی ایک ابدی حقیقت ہے۔ حوادثِ زمانہ سے بے نیاز اور تغیر وتبدل سے محفوظ ومصئون مگر دین جس ثقافت میں جلوہ گر ہوتا ہے اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ابدی ہے۔ ثقافت کو دوسرے مظاہر حیات کی طرح ارتقا کرتے رہنا چاہئیے تا کہ اس میں دین کی جلوہ گری بتدریج کمال کی طرف بڑھتی جائے۔

دین اسلام عرب ثقافت کے چوکھٹے میں ظہور پذیر ہوا اور اس ثقافت میں ایک عظیم انقلاب کا باعث ہوا۔ لیکن یہ انقلاب کامل نہیں تھا۔ اور نہ دفعتاً واقع ہوا یہ ایک تدریجی انقلاب تھا۔ جس کی وجہ سے قدیم عرب ثقافت کا زینہ بزینہ تسویہ اور تزکیہ کیا گیا۔ اس ثقافت کے جو اجزاء صریحاً قبیح و مذموم تھے ان کا بالکلیہ استیصال کیا گیا۔ جن اجزاء میں کوئی نمایاں قباحت نہیں تھی انہیں علی حالہ رہنے دیا گیا کیونکہ دین کی جو حرکی قوت مہیا کی گئی تھی ان کی ترقی واصلاح کی ضامن تھی۔ ابتدائی مسلمانوں نے یہ صاف اور پاک کی ہوئی ثقافت اختیار کر لی اور غیر مسلم اقوام میں مبلغین دین اِسلام اور اس سے وابستہ ثقافت دونوں کی اشاعت کرتے رہے غیر مسلم اقوام بھی اسلام کے دونوں اجزاء کو بلا چوں و چرا قبول کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلم اقوام نے نہ صرف دین اسلام کو اپنے دین سے افضل تر اور

اعلیٰ تر پایا بلکہ اس اسلامی ثقافت کو بھی اپنی ثقافت سے بہتر اور خوب تر دیکھا۔ اِسی لئے عرصہ تک اسلامی دین اور اسلامی ثقافت میں فرق و امتیاز کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی صدیوں تک قائم رہنے سے یہ ربط اتنا مضبوط ہوگیا کہ عام مسلمان کی نظر میں اسلامی ثقافت، اسلام کا جزو لاینفک ہوگیا اور اس کا اعتقاد دین اور ثقافت دونوں سے اسی مضبوطی سے وابستہ ہوگیا۔

عصر جدید کا شدید تقاضہ ہے کہ دین اسلام اور مروّجہ اسلامی ثقافت میں واضح طور پر امتیاز کیا جائے تاکہ ثقافت میں پیدا شدہ جمود کو دفع کیا جائے اور اس کی اصلاح و ترقی کی راہ کھول دی جائے۔

تقریباً ایک صدی پہلے مسلم مصلحین کو اس ضرورت کا احساس ہوگیا تھا اور ہر مصلح اور مجدد نے اسلام کی ابدی عنصر کو عارضی لواحق سے الگ کرنے کی مہم شروع کردی تھی بالخصوص سید احمد خاں اور ڈاکٹر اقبال کی پیہم کوشش رہی کہ مرجہ اسلام کے مخلوط کا تجربہ کرکے خالص دین اسلام کو اس کی پوری تابناکی کے ساتھ پیش کریں۔ ان کی رائے تھی کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے بلکہ ناگزیر ہے۔ اقبال کی نظر میں دین اسلام ایک حرکی اور تخلیقی قوت ہے جس کا اظہار لازماً کسی نہ کسی مناسب و موزوں صورت ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ صورتیں ابدی نہیں ہوسکتیں۔ ہر صورت کسی نہ کسی زمانہ سے وابستہ ہوتی ہے اور زمانہ بدل جانے پر اس سے دین کا اظہار ناقص اور ناکافی طور ہونے لگتا ہے۔ اس وقت دین کے بہتر اظہار کے لئے کسی دوسری صورت کی تلاش مسلم کا فرض ہے۔ کسی ایک متعین صورت میں دین کا اظہار ممکن نہیں ایک مسلمان کے دل میں تمنا بیدار رہنی چاہئیے اور ان صورتوں کی تلاش سے جو دین سے قریب اور قریب تر ہوتی جائیں اُسے دست کش نہیں ہونا چاہئیے۔

صورتِ گر نقاشم ہر لحظہ بُتے سازم — وانگہ ہمہ بت ہارا در پیش تو اندازم
صد نقش بر انگیزم با روح در آمیزم — چوں نقشِ ترا بینم در آتشش اندازم

قرآن کی رو سے خدا اگر "الیوم کما کان" ہے تو "کُلّ یومٍ ھو فی شان" بھی ہے عصر جدید میں اس کی جو شان جلوہ ریز ہے اس سے صرفِ نظر کرنا ضعفِ ایمان اور ضعفِ عقل پر دلالت کرتا ہے۔ اسلامی دین خدا کی ابدیت کا مظہر ہے مگر اسلامی ثقافت اس کی شان کے تابع ہے۔ ثقافت کو اس کی شان کی نیرنگی کا ساتھ دینا چاہئیے۔ اس کی ابدیت واحد ہے لیکن اس کی شانیں لامحدود۔

کسی مسلمان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مروجہ اسلامی ثقافت سے قطع تعلق کرے لیکن

اس سے بجا طور پر یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ثقافت میں ضروری ترمیم و تبدیلی اور اصلاح و ترقی سے گریز نہیں کرے گا۔ اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اسلامی ثقافت اسلامی دین کی بہتر سے بہتر آئینہ داری کرتی رہے اور دین سے زیادہ سے زیادہ مطابق ہوتی جائے مروّجہ اسلامی ثقافت کے کون سے اجزا ترک کر دینا چاہیے اور کون سے ترمیم و اصلاح کے متقاضی ہیں ان امور پر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کو غور و فکر کرنا چاہیے لیکن پہلے اس اصول کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ دین اور ثقافت میں حقیقی فرق ہے اور اس فرق کو پیش نظر رکھنا دین کے تصفیہ، تزکیہ اور تحفظ کے لئے ضروری ہے۔

اب اس سوال کو لیجئے کہ جس دین کا حامل قرآن ہے، وہ کیا ہے۔ اس کا واضح جواب قرآن میں بھی موجود ہے۔

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ، اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ‌ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ‌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (سورۂ یوسف ۱۲)

ترجمہ: ''خلق کائنات تم جس سے منسوب کرتے ہو وہ صرف نام ہیں جو تمہارے ذہن کی پیداوار ہیں اور ان کا وجودِ حقیقی سے کوئی واسطہ نہیں۔ خدا ہی کو قدرتِ کاملہ حاصل ہے اور وہی منبع اقدار ہے اس کا حکم ہے کہ تم سوائے اس کے کسی اور کی پرستش اور خدمت نہ کرو یہی دین قیم ہے''۔ (سورۂ یوسف ۱۲)

بت پرستوں کے اصنام ہوں یا مادہ پرستوں کا مادّہ، فلسفی کا Elan-Vital ہو یا کمیونسٹوں Dialectic سب انسانی ذہن کی تخلیقات ہیں یا تجریدات ہیں، جو عالم محسوسات سے کشید کئے گئے ہیں۔ پروفیسر ہائزن برگ کہتا ہے کہ سائنس کے تصورات تجریدات ہیں اور ان کے درجہ تجرید میں جتنا اضافہ ہوتا جائے حقیقت سے ان کا بعد اسی نسبت سے بڑھتا جاتا ہے۔ برخلاف ان کے خدا کا تصور حقیقت سے قریب اور مربوط ہے۔

ایک اور آیت شریف میں دین قیم کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وَمَنۡ يُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى‌ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ (سورہ لقمان آیت ۱۳)

ترجمہ ''جو شخص مشیت ایزدی کے مقابل سر تسلیم خم کرے اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے اس نے

ایسے محکم اصول کو تھام لیا ہے جو بلا شک اس کی رہبری فلاح دارین کی جانب کرے گا اور جملہ امور و واقعات اسی انجام کو پہنچتے ہیں جو خدا چاہتا ہے''۔ دین کے دو جزوِ لازم بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تسلیم رضا جو خدا پر اعتقاد کی متضمن ہے اور دوسرا اوروں کی بھلائی کے کام میں سرگرم رہنا۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُم مَّغفرۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ

ترجمہ: ''جو انسان بھی خدا پر ایمان رکھے اور عمل صالح یعنی فلاح عامہ کا کام کرے اس کی نجات ہے اور اسے رزق کریم عطا ہوگا''۔ رزق جسم کو تقویت بخشتا ہے۔ رزق کریم سے روح اور خودی کو تقویت اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔ حشو و زوائد سے پاک اور خالص دین یہی ہے۔ اور جس شخص کے ذہن میں یہ جاگزیں ہے وہ مسلمان ہے۔ یہ دین جس ثقافت میں بھی ظاہر ہو وہ قدر کی حامل اور لائق تحفظ ہے۔ کسی ثقافت کو جانچنے کے لئے یہی دین معیار ہو سکتا ہے۔ قدامت کے معیار سے ثقافت کو جانچنا ناجائز ہے ترقی کناں ثقافت وہی ہے جو دین کو بلند درجات پر ظاہر کرتی جائے۔

دیر و حرم آئینہ تکرارِ تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اسلامی انقلاب

اسلام ایک زبردست انقلاب کا حامل تھا۔ اس انقلاب نے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اسلام کے انداز فکر اور تصور کائنات کو یکسر بدل دیا۔ لیکن اس کی خصوصیات طریقہ کار اور مضمرات پر نسبتاً کم غور کیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس کی انقلابی روح قلوب میں زندہ نہ رہ سکی۔

۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب اور ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب دور جدید کے عظیم انقلابات میں ان کا مقابلہ انسان کی انقلابی تحریک سے کیا جائے تو ان انقلابات کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ ان انقلابات کا مقصد سابقہ نظام کی یکسر بیخ کنی اور اس کی جگہ بالکلیہ نئے نظام کی تعمیر تھا۔ ان انقلابات کے قائدین اس تصور کے تحت عمل پیرا تھے کہ سابقہ نظام، سماج کے ایک محدود طبقہ کے مفادات کا ضامن اور عامتہ الناس کے بے رحمانہ استحصال کا ذریعہ تھا۔ ان کا ایقان تھا کہ عوام کو قید و بند سے رہائی دلانا۔ قدیم تصورات کے استرداد، مروجہ قوانین و ضوابط کی تنسیخ اور اداروں کی شکست و ریخت سے ہی ممکن ہے۔ اسی لئے ان کے پروگرام میں تخریب کو اولیت حاصل تھی۔ سابقہ نظام کے تعلق سے اسلام کا نقطہ نظر تخریبی کے بجائے تنقیدی اور اصلاحی تھا۔ اور اس کا اولین مقصد یہ تھا کہ انسان اعلیٰ اقدار کو کھو نہ دے جو اس نے اپنی جدو جہد سے صدیوں میں حاصل کئے ہیں۔ اقدار حاصلہ کا تحفظ اسلامی منصوبہ کا اہم جز تھا۔ جن میں اقدار کے تحفظ کی تاکید قرآن میں کی گئی ہے ان کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

انسان کی ذات' قدر حقیقی کا مستقر ہے اور اس قدر کی افزائش اور اس کا استحکام اس کا فرض ہے۔ کوئی انسان دوسرے کے اعمال کے لئے جوابدہ نہیں اور نہ اسے دوسروں کے اعمال کے نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ ہر انسان اسی شئے سے متمتع ہوگا جو وہ اپنی ذاتی سعی سے حاصل کرے۔ انسان کی سعی بشرطیکہ وہ صحیح ہو رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہر سعی اس زندگی اور مابعد زندگی میں نتیجہ خیز اور ثمر آور ہوگی۔ انسان اپنی ذاتی سعی سے جو افزائش خیر کرے وہ ضائع نہیں جائے گی بلکہ وہ خود اور کائنات دونوں اس سے متمتع ہوں گے اور انسان کی منزل بارگاہِ ایزدی ہے جس سے تقرب اس کی زندگی کا مقصد ہونا

چاہیئے۔ان اقدار کے تصفیہ، تزکیہ اور تحفظ کا کام اسلام کے پروگرام کا پہلا حصہ تھا۔دوسرا حصہ مستقبل میں صحتمند تبدیلی اور ترقی کی راہیں کھولنا تھا اور اس کا انقلابی پہلو اسی حصہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ترقی کی راہ میں بیشتر کورانہ تقلید اور بے جا قدامت پرستی حائل ہوتے ہیں۔ایسے قدامت پرستوں کے خلاف جو زندگی کو منجمد کر دینا چاہتے ہیں قرآن میں دلیرانہ اقدام کیا گیا ہے۔ان سے ایک راست سوال کیا گیا ہے کہ کیا تم اپنے آبائی مسلک پر قائم رہو گے جب کہ اس کی خامیاں اور نقائص تم پر واضح ہو چکی ہیں۔ کیا تم خود غور و فکر نہیں کرتے۔اس طرح سابقہ نظام کی ترمیم اور اصلاح ہدایت کی تمہید تھی۔اس طرح اسلامی انقلاب کا طریقہ کار مخصوص اور دوسرے انقلابات سے منفرد تھا۔تدریج تبدیلی اور اصلاح کا طریقہ کار اختیار کیا گیا کہ اس انقلاب کے اثرات مستقل، پائیدار اور کسی ردعمل کے اثرات سے محفوظ رہیں۔مخالفین کا ایک اعتراض یہ ہے کہ بعض سماجی برائیوں کا استحصال کرنے کی بجائے ان کی کانٹ چھانٹ پر اکتفا کیا گیا یہ اعتراض اسلام کے مخصوص طریقہ کار سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ جو برائیاں سماج میں دور تک جڑ پکڑتی ہیں اگر ان کا ایک ہی ضرب میں قلع قمع کیا گیا تو وہ پھر پچھلے دروازے سے داخل ہو گئیں انقلاب کا اکثر نتیجہ ردانقلاب (Counter-Revolution) ہوا ہے۔چنانچہ فرانسیسی انقلاب کے بعد بھی یہی ہوا۔روسی انقلاب بظاہر محفوظ معلوم ہوتا تھا لیکن (Revisionism) تحریف پسندی اور نیو کلاس ایک قسم کے ردانقلاب کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔اسلامی انقلاب کا یہ طریقہ تھا کہ برائی کو ممکنہ حد تک گھٹا دیا جائے تاکہ انسان عقل اور تجربہ میں ترقی کے ساتھ بتدریج اس سے بالکلیہ نجات پالے۔اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ایسا قدم بڑھائے کہ پھر پیچھے ہٹنے پر مجبور نہ ہو اور اس کا قدم اٹھے تو پھر آگے کی طرف ہی ہو۔اگر اس رہنمائی کے باوجود قدم آگے کی سمت نہ بڑھائے تو اس کا قصور ہے اسلام کا نہیں، اسی محتاط طریقہ کی بدولت جو اصلاحات روبہ عمل آئیں وہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے ثقافتی اثاثہ کا جزو لاینفک بن گئیں۔اگر ترقی و اصلاح کی اس راہ پر مسلمان بدستور گامزن نہیں رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پھر اسی قدامت پرستی میں گرفتار ہو گئے جس سے اسلام نے انہیں رہا کیا تھا۔

انسانی سماج میں جو انقلاب اسلام کے ذریعہ رونما ہوا۔اسے ہم اسی نقطہ نظر سے سمجھ سکتے ہیں۔اسلام کا پہلا کارنامہ یہ انقلابی تصور تھا کہ مذہب انسان اور خدا کے درمیان راست معاملہ ہے جس میں اور کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔اس کے نتیجہ میں انسان کو (Priest hood) سے جو ہمیشہ عوام کا استحصال کرتی رہی ہے نجات مل گئی اسلامی نظم میں ایسے شخص کا کوئی مقام نہیں جو مذہب کو پیشہ کے طور پر اختیار

کرے اور اس کو حلبِ منفعت کا ذریعہ بنائے اسلامی انقلاب نے انسانی سماج کو ایک ایسے جابر طبقہ کے چنگل سے رہائی دلائی جو انسان اور خدا کے درمیان وساطت کے حق کا دعویدار تھا اور مذہب کو حصولِ اقتدار و دولت کا ذریعہ بنایا ہوا تھا مذہبی آزادی اسلام کا گراں بہا عطیہ ہے۔

عہد ماضی کی ایک اور قبیح رسم غلامی کی تھی جو کسی نہ کسی شکل میں تقریباً ہر ملک میں پائی جاتی تھی سماج میں اس کی جڑیں مضبوط اور گہری تھیں۔ ایک جنبش قلم سے اس کو منسوخ کر دینا ممکن العمل نہیں تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو وہ کسی اور شکل میں عود کر آتی۔ اسی لئے ایسی تدابیر اختیار کی گئیں کہ یہ مذموم رسم گھٹتے گھٹتے ناپید ہو جائے۔ اس پر دو سمتوں سے حملہ کیا گیا۔ ایک طرف تو ایسی موثر تدابیر اختیار کی گئیں کہ غلاموں کی تعداد مسلسل کم ہوتی جائے۔ دوسری طرف غلام کی حالت بہتر کرنے اور اس کو انسانی حقوق سے متمتع ہونے کا بندوبست کیا گیا۔ کئی گناہوں کا کفارہ غلام کو آزاد کرنے سے ہی ممکن تھا اور غلام سے حسنِ سلوک اور مساوات کے برتاؤ سے اس میں اور آزاد انسان میں فرق کم ہوتا گیا۔ اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ غلاموں کے طبقہ نے اسلامی مملکتوں کے مابعد زمانے میں کئی حاکم اور فرمانروا فراہم کئے۔

اسلامی انقلاب کا ایک اور درخشاں کارنامہ سماج میں عورت کے مرتبہ کو بلند کرنا اور اس کے ان تمام انسانی حقوق کو بحال کرنا تھا جس سے وہ عرصہ دراز سے محروم تھی۔ اسے اپنی ذاتی جائیداد رکھنے اور اپنی پسند کے شخص سے عقد کرنے کے اہم حقوق عطا کئے گئے۔

سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے درمیان فرق و امتیاز کو کم کرنے اور ایک طبقی سماج کے لئے راہ ہموار کرنے کی موثر تدابیر اختیار کی گئیں۔ قوانین وراثت' صدقات اور انفاق کے احکام سے ارتکاز دولت کا سدباب اور سماج میں دولت کی منصفانہ تقسیم کا بندوبست کیا گیا۔ جسمانی محنت سے روزی کمانے کو عبادت کا درجہ دیا گیا اور یہ تلقین کی گئی کہ انسان کی قدر و منزلت کا تعین اس کے کردار و سیرت سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے حسب نسب سے۔ انسانی مساوات کے اصول کو جزوِ دین قرار دیا گیا۔

یہ سب اسلامی انقلاب کے ثمرات تھے جن سے آج بھی اسلامی سماج مستفید ہو رہا ہے لیکن اسلام کا مقصد یہ تھا کہ اس کی انقلابی تحریک کہیں رکے نہیں بلکہ ہمیشہ جاری رہے اور اس کے پیرو اس پر سبک خرام رہیں جس کی جانب ان کی رہبری کی گئی ہے۔ فطرت انسانی میں قدامت پرستی اور تجدد پسندی کے متضاد رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اسلامی انقلاب دونوں کے توازن کی انوکھی مثال پیش کرتا ہے۔

❁❁❁

شک واعتقاد

قائدین مذہب دینی عقائد کو شک وشبہ کے حملوں سے محفوظ رکھنا اپنا فرض اولین تصور کرتے رہے ہیں۔ امور دینوی اور علوم ظاہری میں اس کی اہمیت اور افادیت سے وہ انکار نہیں کرتے مگر باور کرتے ہیں کہ مذہب کی مقدس سرزمین پر اعتقادِ راسخ اور یقین واثق کی فرمانرائی ہونی چاہیئے تا کہ عقائد مذہبی شک کی بادِ سموم سے محفوظ سرسبز اور شاداب رہیں۔ ان کی رائے میں مذہب کی سلامتی کا انحصار اسی پر ہے کہ شک کے لئے دروازے بند رکھے جائیں۔

انھیں خوف ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی شک کو مذہب میں دخل دینے کا موقع دیا گیا تو اس کی شر انگیزی اور فتنہ پردازی پر قابو پانا عام انسان تو کجا متقی اور پارسا کے لئے بھی دشوار ہوگا۔ اس نقطہ نظر سے اعتقاد قدر مثبت رکھتا ہے اور شک قدرِ منفی جس سے احتراز ہی مناسب ہے۔ اس رائے میں اس حد تک صداقت ضرور ہے کہ اعتقاد اطمینان قلب اور جمعیت خاطر کا باعث ہوتا ہے۔ اور شک اضطراب اور انتشار کا سبب۔ اسی لئے انسان فطرتاً اعتقاد کی طرف رجوع ہوتا ہے اور شک سے گریز کرتا ہے۔ مگر یہ ماننا پڑتا ہے کہ شک قوائے فکریہ کو حرکت میں لاتا ہے جہاں بینی اور تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اس طرح تلاش حق میں ہمیں گرم رَو رکھتا ہے۔ اسی لئے مذہب جیسے اہم ترین رقبہ فکر وعمل سے اسے خارج رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔

مذہب کے تعلق سے شک کا مطلقاً سد باب کرنا ذہنی صحت کے لئے مضر اور فکری دیانتداری کے منافی ہے، جس طرح جسمانی صحت کا انحصار جسم کے ہر حصہ میں دوران خون کے بلا رکاوٹ جاری رہنے پر ہے اسی طرح صحت ذہنی کے لئے ضروری ہے کہ ہر گوشہ میں خیالات کی آمد ورفت میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ خیالات کی تنقید ان کے باہمی تصادم کے ذریعہ ہی ممکن ہے کسی خیال کے مبنی بر حقیقت ہونے کا ثبوت اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ مخالف خیالات سے ٹکرانے کے بعد ان کا وجود قائم ہے۔ غلط خیال اس ٹکراؤ کی تاب نہیں لاتا اور رد کر دیا جاتا ہے۔

خیالات اور ایقانات کی اس جنگ میں فرسودہ خیالات اور جو ایقانات صداقت سے عاری ہیں فنا ہو جاتے ہیں۔ وہی باقی رہتے ہیں جو حقیقت سے تطابق رکھتے ہیں۔ ہر خیال دوسرے خیال کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ مذہبی عقائد کو اگر ذہن کے علحدہ کمرہ میں بند کر دیا جائے جہاں تنقیدی ہوا کا گزر ہی نہیں تو لازماً بے جان ہو جائیں گے اور حقیقت سے ان کا ربط گھٹتے گھٹتے منقطع ہو جائے گا۔ وہ کسی مجنون کے آسیبی خیالات کے مماثل ہو جائیں گے ایسے بند کمروں کی موجودگی میں نہ ذہن کی صحت برقرار رہ سکتی ہے نہ اس کی کارکردگی۔ سچے اور کارآمد خیالات تنقید کی فضاء میں ہی پیدا ہوتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں۔ اگر معتقداتِ مذہب کے باقی مظروفاتِ ذہن سے تمام رشتے توڑ دیئے جائیں اور انھیں اس طرح الگ تھلگ رکھا جائے کہ نہ ان پر عقل کی ضیاء پاشی ہو نہ تنقید کی ہوائیں چلیں تو وہ نہ حقیقت کی عکاسی کر سکیں گے، نہ زندگی میں رہنمائی کا فرض انجام دے سکیں گے۔ انسانی عمل پر اُن کا اثر تو پڑتا رہے گا۔ مگر وہ علم تجربے اور عقل کے خلاف ہوگا۔ عمل میں تضاد پیدا ہوگا اور اس کی کارکردگی بُری طرح متاثر ہوگی۔ طبعی علوم میں ہمارے ایقانات ایک قسم کے ہوں گے اور دین کے دائرہ میں بالکل ان سے متضاد۔ اعمالِ فکری میں تضاد کی وجہ سے ہم صحیح طور پر سوچ نہیں سکیں گے اور ہمارا عمل کامیابی سے محروم رہے گا۔

فکری دیانت داری بھی اس وقت ممکن ہے کہ عقائد دین اور دوسرے ایقانات میں کوئی خلیج حائل نہ ہو اور ان دونوں میں ہم آہنگی اور ربط وضبط پایا جائے۔ فرض کیجئے کہ ہماری سوچ بچار ہمیں ایسے نتیجہ پر پہنچا رہی ہو جو ہمارے عقیدہ سے میل نہیں کھاتا، دیانت داری یہ ہوگی کہ ہم نتیجہ کو تسلیم کریں اور اعتراف کریں کہ وہ عقیدہ کے خلاف ہے۔

اس کے بجائے اگر ہم اپنے استدلال کو اس اندیشہ سے کہ وہ ناپسندیدہ اور ناگوار نتیجہ پر پہنچائے گا روک دیں یا اس کا رخ موڑ دیں تو ہم یقیناً ذہنی بددیانتی کے مرتکب ہوں گے۔ اگر ہم نتیجہ کو توڑ مروڑ کر کسی طرح عقیدہ کے مطابق کر لیں تو یہ دیانت داری سے بعید ہوگا۔

ایک حدیث شریف ہے کہ مومن کا مقام بیم ورجا خوف وامید کے درمیان ہوتا ہے خوف کا رشتہ شک سے ہے، کیونکہ ہمارے عمل کا نتیجہ غیر یقینی ہو تو خوف دامنگیر ہوتا ہے، اسی طرح امید کا تعلق اعتقاد سے ہے اس لئے اگر ہم اس حدیث شریف کی تاویل یوں کریں کہ مومن کا مقام شک واعتقاد کے درمیان ہوتا ہے تو غالباً اس کے صحیح منشاء ومدعا سے بہت دور نہیں جا پڑیں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ

نہیں کہ مومن کا ذہن شک اور اعتقاد کے متقابل نقطوں کے بیچ میں ساکن ہوتا ہے۔ سکون ذہن کا تعلق ہے اور حرکت اس کی زندگی۔ صحیح تصور یہ ہوگا کہ شک اعتقاد کے انتہائی نقطوں یا سروں کے درمیان ذہن کی حرکت جاری وساری رہتی ہے۔ ایک وقت وہ اعتقاد سے قریب ہوتا ہے مگر ہر ردعمل کے نتیجہ میں اس کی حرکت کا رخ شک کی سمت ہو جاتا ہے اس کے بعد دوبارہ اعتقاد سے قریب ہونے لگتا ہے اس تصور میں مزید اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر ذہن ایک ہی سطح پر آگے بڑھتا اور پیچھے ہٹتا رہے تو ترقی اور بصیرت میں اضافہ اور ازدیاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایسا سفر ہوگا جو بے مقصد اور کسی منزل کو نہیں پہنچاتا' اصل حقیقت یہ ہے کہ جب ذہن شک سے ہم آغوش ہونے کے بعد پھر اعتقاد کو قبول کرتا ہے۔ تو یہ اعتقاد سابقہ اعتقاد سے ارفع اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور اس طرح اعتقاد کے بعد کا شک سابقہ شک سے زیادہ ذی ثروت اور بلند تر ہوتا ہے اس طرح ہر مابعد منزل پر شک اور اعتقاد دونوں پہلے سے زیادہ قدر کے حامل اور قیمتی ہوتے ہیں' شک اور اعتقاد دونوں ایک دوسرے سے فیضیاب اور سیراب ہوتے ہیں تو ذہن اور روحانی ترقی بے روک ٹوک جاری رہتی ہے۔ اعتقاد میں شک کا امتزاج اس کی توانائی کو بڑھاتا اور اس کی ثروت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح خالص شک ایک محض منفی ذہنی انداز ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر جب اس میں اعتقاد کی آمیزش ہوتی ہے تو تلاشِ حقیقت اور طلب صداقت کی صورت اختیار کرتا اور ثمر آور و نتیجہ خیز دریافت و تحقیق کا محرک ہو جاتا ہے۔ محض اعتقاد پر جم جانا اور شک سے مطلقاً منہ موڑ لینا مذہب کا جمود ہے روحانی ترقی اور حقائق دین میں بصیرت اور ژرف نگاہی اسی صورت میں ممکن ہے کہ شک اعتقاد کی آبیاری کرتا رہے' اور اعتقاد کی باد بہاری شک کو تازہ و شاداب کرتی رہے۔ شک و اعتقاد ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر روحانی ترقی اضداد کے امتزاج اور ترکیب کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔

سقراط کا قول ہے کہ بے جانچی ہوئی زندگی انسان کے شایانِ شان نہیں' بدلتے ہوئے حالات اور بڑھتے ہوئے علم کی روشنی میں ہمیں اپنے اعتقادات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہنا اور انھیں جانچتے پرکھتے رہنا چاہیئے اگر ہم اس دشوار اور ناگوار مگر ضروری فریضہ کو انجام نہ دیں تو ہمارا ذہن اذکارِ رفتہ اور بعید از حقیقت اعتقادات کے انبار کے نیچے دب کر رہ جائے گا۔ اور تحقیق و انکشاف کی قوتِ اس سے سلب ہو جائے گی جستجوئے صداقت میں ہم اسی وقت مصروف ہوتے ہیں جب کہ اپنے مسلّمہ عقائد کے تعلق سے شک پیدا ہو۔ ان نقائص اور خامیوں کا احساس ہو اور انھیں بہتر اور حقیقت سے زیادہ

موافق بنانے کی تحریک ہو۔ یہ تحریک شک ہی مہیا کرتی ہے۔ شک کے بغیر نہ علمی ترقی ممکن ہے نہ روحانی۔ شک وہ گراں بہا عطیہ ہے۔ جو قدرت نے انسان کو عطا کیا ہے۔ اور جس سے جانور محروم ہیں ۔ اعتقاد میں یقیناً سکون، اطمینان اور راحت ہے مگر شک میں بھی ایک لذّت ہے جس سے وہی واقف ہیں جو طلبِ صداقت میں سرگرم رہتے ہیں ۔

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی

اقبالؒ کہتے ہیں کہ سفر میں جو لطف ہے منزل کو پہنچ جانے میں نہیں۔ تلاش میں جو نشاط ہے۔ وہ دریافت کی مسرت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ منزل اعتقاد ہے جس کی آغوش میں ہم اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں مگر اس منزل تک پہنچنا ایک طویل سفر کے بعد ہی ممکن ہے۔ اس سفر میں کئی مقامات ملتے ہیں جو ہمیں منزل کا فریب دیتے ہیں اور خواب راحت کی دعوت دیتے ہیں اگر شک ہمیں مسلسل مہمیز نہ لگاتا رہے تو ہم منزل پر کبھی نہ پہنچیں گے اور کسی گھٹیا عقیدہ کو آخری صداقت باور کر کے تلاش و جستجو سے دست کش ہو جائیں گے۔ شک ہمیں مجبور کرتا ہے کہ کسی کم تر عقیدہ پر قناعت نہ کریں اور مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں، بلکہ تلاشِ حقیقت میں سرگرم رہیں۔ ممکن ہے کہ عمر بھر کوشش سے ہمیں صداقت کا پتہ نہ چلے مگر یہ سعی لاحاصل نہیں بلکہ گھٹیا عقیدہ پر قرار پذیر ہونے سے بہتر ہے۔

انگریزی شاعر براؤننگ کہتا ہے کہ شک کی قدر کرنا چاہیئے اور اسے عزیز رکھنا چاہیئے یہی انسان کو دوسرے جانداروں سے ممیّز و ممتاز کرتا ہے۔ شک کی چنگاری کے بغیر انسان ایک خاک کا تودہ ہے۔

شکم سیر جانور شک سے نا آشنا ہے مگر اضطراب انسان کو تلاشِ حقیقت میں گرم رو رکھتا ہے۔ مسلسل ناکامی کی وجہ سے حصولِ مطلوب سے نا اُمید بھی ہو جائے تو اس کی خواہش اور تمنا اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی ۔

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

شک سے خوف و اندیشہ، دین کے ایک غلط تصور کی پیداوار ہے عام پابندِ مذہب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عقائد دین نازک پودے ہیں جو شک کی بادِ سموم سے جھلس کر رہ جائیں گے۔ حالانکہ اگر عقیدہ صداقت سے مملو اور حقیقت پر مبنی ہے تو وہ ایک تناور درخت کی طرح ہے جس کو آندھیوں کے جھکڑ جھکا سکتے ہیں مگر اکھیڑ نہیں سکتے۔ عقائد کو تنقید کی آگ میں تپائے رکھنا چاہیئے تا کہ وہ حشو و زوائد اور غل و غش سے پاک صاف رہیں اور صداقت کی آئینہ برادری کریں۔

جولوگ عقائد کو شک کی دست رس سے باہر ایک طاقِ بلند پر محفوظ رکھتے ہیں' دراصل وہ ان کے متعلق شک میں مبتلا ہیں انھیں اس میں شک ہے کہ عقائد دین تنقید کی ترک تازی کی تاب لاسکیں گے۔ یہ شک اس کے غیر شعور میں متمکن ہے اور شعوری ذہن اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ اگر ان کا شک ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقائد ہماری ذاتی خواہشات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حقیقت کی نہیں ۔ ایسے عقائد کو ذہن سے نکال دینا روحانی ترقی کی راہ سے رکاوٹیں دور کرنا ہے' اور اگر عقائد حقیقت کا عنصر رکھتے ہیں تو جانچ پڑتال ان کے استحکام کا باعث ہوگی ۔شکست وریخت کا نہیں ۔ ہر صورت میں تنقید کا نتیجہ مفید ہی ہوگا۔ اگر عقائد صداقت کے حامل نہیں تو انھیں جانچ پڑتال اور شکست کے حملوں سے کوئی خطرہ نہیں اور اگر ان میں کھلی تنقید کی تاب نہیں ہے تو ان کی حیثیت اوہام کی ہے۔ جنھیں جتنا جلد ہم ترک کردیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

❁❁❁

قرآن اور اقبالؔ

قرآن پاک اسلام کی واحد اور حقیقی بنیاد ہے اور ملتِ اسلامیہ کا مضبوط اور اٹوٹ رشتہ اتحاد۔ جب تک مسلمان قرآن سے وابستہ رہیں گے ان کا مستقبل محفوظ اور تابناک رہے گا۔ لیکن محض قرآن کا احترام اور اس سے جذباتی وابستگی خواہ وہ کتنی ہی شدید ہو کافی نہیں ہے۔ ضروری یہ ہے کہ جس پیام خداوندی کا قرآن حامل ہے وہ ذہن میں سرائیت کر جائے اور نفس اس کے نفحات سے معطر رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قرآن کو نہ صرف پڑھیں بلکہ اس پر غور و خوص کریں اور اس کے اسرار کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں، جرمن مفکر گوئٹے کا قول ہے۔

''Du Gleiohst Dem Geist Den Du Begseifst......'' یعنی ''جس چیز کی روح یعنی ماہیت کا تم بخوبی ادراک کرتے ہو اسی شئے کے مانند ہو جاتے ہو'' اب یہ سوال ہے کہ قرآن کو بخوبی سمجھنے کے لئے ہم کیا طریقہ اختیار کریں۔ اس کے لئے ہم دو طریقے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اس لئے دونوں ضروری ہیں ہم کسی ایک پر اکتفا نہیں کر سکتے۔

پہلے طریقہ کی نشاندہی خود قرآن میں کر دی گئی ہے **وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ ط**

(سورہ ۲۲ آیت ۷۸)

ہمیں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئیے۔ اس کے معانی و مطالب پر غور کرنا اور اس غور و خوص کو جاری رکھنا چاہئیے۔ مگر اس کے ساتھ ضروری احتیاط بھی ملحوظ رکھنی چاہئیے خدا لامحدود ہے اور پیام خداوندی کی معنوی ثروت بھی لامحدود ہے۔ کسی مقام پر ہمیں شدید احساس ہوگا کہ ہم آیت قرآنی کے حقیقی معنی سمجھ گئے ہیں اور ترغیب ہوگی کہ اس کو آخری اور قطعی سمجھیں اور دوسروں پر اسے مسلط کریں۔ اسی ترغیب کی متابعت سے متعدد فرقے پیدا ہوئے اور ملّت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ حق ہمیں ضرور ہے کہ اپنی دریافت کو دوسروں پر پیش کریں لیکن یہ حق نہیں کہ اس کو دوسروں پر مسلط کریں۔ یہی نہیں بلکہ اس اکتشاف کے بعد بھی اپنا تجسس جاری رکھنا چاہئیے۔ اس اکتشاف پر قانع رہنا غلطی

ہے۔ جہاد فی اللہ جاری رہنا چاہیئے کیونکہ اس کی منزل مقصود ہمارے ادراک سے پرے ہے۔ اس انکشاف پر اصرار کرنا بھی خطا کاری ہے۔ کسی آیتِ کریمہ کے جو معنی ہم پر منکشف ہوتے ہیں اسے بحث ومباحثہ سے منوانے کے قرآن پاک میں صریح ممانعت کی گئی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِىْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ (س ۴۰ آیت ۶۹)

آیات قرآنی مشعل ہدایت ہیں ان کی روشنی میں صراط مستقیم کی تلاش ہمارا فرض ہے۔ انھیں بحث ومباحثہ کا موضوع بنانا بے ادبی ہی نہیں گمراہی کو دعوت دینا ہے ذاتی تجسس کا طریقہ ثمر آور ہے مگر اس پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ اس کی تکمیل دوسرے طریقہ سے کرنا چاہیئے۔ ان صاحبِ دل بلند پایہ مفکرین کے افکار سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے۔ جو عرصہ دراز تک قرآن کی معنوی گہرائیوں میں غواصی کرتے رہے۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے علماء کی تحقیقات سے ہمیں قرآن کو سمجھنے میں موثر امداد حاصل ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے افکار ہمارے لئے اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ عصرِ جدید کی علمی زبان سے کما حقہ واقف تھے اور قرآنی مطالب کو ان تصورات میں پیش کرتے تھے جو زمانہ حال کی علمی دنیا میں قابل قبول ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم قرآن کے متعلق اقبال کے نقطہ نظر کو سمجھنا ہے۔ اس کی ابتداء ہم اقبال کے اس شعر سے کر سکتے ہیں۔

مکتب و ملاّ و اسرارِ کتاب کورِ مادرزاد و نورِ آفتاب

اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلطی ہوگی کہ اقبال ملاّ کے بالکلیہ مخالف تھے۔ ایک محدود دائرہ میں اس کی اہمیت اور افادیت کا انھیں اعتراف ہے۔ انھیں صرف قرآن کے متعلق اس کے زاویہ نگاہ اور مطالب قرآن میں اس کے مقصودِ تلاش سے اختلاف ہے۔ ملاّ قرآن میں دینیات تلاش کرتا ہے اور اقبال دین۔ ملاّ قرآن کی مدد سے اسلام کی ظاہری صورت کا تعین کرنا چاہتا ہے اور اقبال سرچشمہ اسلام سے آبِ حیات حاصل کرنا۔ صورت بھی ضروری ہے۔ دین کی بنیاد پر سماجی تنظیم، انضباط ملت اسی وقت ممکن ہے کہ دین کا مجرد اور لطیف تصور کسی معین صوری نظام میں متشکل ہو۔ ملاّ کی غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ صورت پر اصرار کرتا ہے۔ اس کی غلطی یہ ہے کہ وہ صورت کو ابدی اور دائمی سمجھتا ہے۔ اور سرچشمۂ دین سے اس کی مسلسل آبیاری سے گریز کرتا ہے۔ خدا اور اس کا دین ابدی ہیں کسی زمانہ میں دین جس خاص صورت میں ظاہر ہوا ہے وہ ابدی نہیں ہو سکتی۔ صورت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (س ۵۵ آیت

۲۶) کی تابع ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَاْنٍ (س ۵۵ آیت ۲۹) کے تحت ہر زمانہ میں حقیقت مطلقہ کی روشنی میں اس کی تجدید ضروری ہوتی ہے۔ مُلّا کی نظر میں قرآن احکام شرعی کا ماخذ ہے اور اقبال کے لئے قرآن ہم سفر ہے جس کے ساتھ وہ ارتقائے روحانی کے منازل طئے کرنا چاہتا ہے۔ دینیات صورت میں مقید ہے اور دین ایک آزاد حرکی اور تخلیقی قوت ہے۔ اقبال اس قوت کا دامن تھام کر صورت سے بلند ہونا چاہتا ہے۔

صورت نہ پرستم من بُتخانہ شکستم من — ایں سیل سبک سیرم ہر بند گستم من

قرآن کے متعلق اپنے زاویہ نگاہ کی تشریح خود اقبال نے واضح طور پر کردی ہے۔

" ISLAM IS AN ASPIRATION AND IS NOT TO BE COMPLETELY IDENTIFIED WITH ITS FULFILLMENT IN PARTICULAR EPOCH IN A PARTICULAR SHAPE, LIFE IS A CREATIVE URGE THAT PERPETUALLY CREATES THE FORMS AND PERPETUALLY TRANSCENDS THEM, WORSHIP OF FORM IS IDOLATORY AND ISLAM BASICALLY IS ICONOCLASTIC"-

بالکل یہی خیال مولانا روم نے بھی ان لطیف اشعار میں کیا ہے۔

صورتِ گر نقاشم ہر لحظہ بتے سازم — وانگہ ہمہ بت ہارا، در پیشِ تو اندازم
صد نقش بر انگیزم با روح در آمیزم — چو نقشِ ترا بینم در آتشش اندازم

(رومی)

اس نقطہ نظر کو تسلیم کیا جائے تو اسلام کے معاشرتی نظام اور معاشی و معاشرتی ضوابط پر نظرِ ثانی کرنے اور انھیں زمانہ حال کے مطالبات سے مطابق کرنے کی راہ کھل جاتی ہے۔ یہ نظام دو حصوں سے مرکب ہے جن میں امتیاز ضروری ہے۔ پہلا حصہ بنیادی ہے اور ایسے اصول پر مشتمل ہے۔ جو انتہائی عمومیت کے حامل اور ابدی ہیں۔ یہ اصول قرآن سے ماخوذ ہیں اور ان میں کسی ردّ و بدل یا کمی بیشی کا ہمیں اختیار نہیں۔ دوسرا حصہ ان مخصوص ضوابط اور معین قواعد پر مشتمل ہے جو کسی زمانے کے خاص سماجی حالات میں بنیادی اصول کے اطلاق کا اظہار کرتے ہیں جو وقتی حالات اور کسی مخصوص زمانے کے مطالبات سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور ان اصول کے حقیقی مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ مثلاً سورۂ رحمٰن میں سماجی معاملات کو ایک بنیادی اصول انصاف کا پابند کیا گیا ہے۔

وَاَقِیمُو الوَزْنَ بِالقِسطِ وَلا تُخسِروا المِیزَانَ (س ۵۵ آیت ۹)

بین الشخصی اور بین الجماعتی تمام معاملات ایسے طے کئے جائیں کہ کسی کا رمق برابر حق تلف نہ ہو ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق بلا کم و کاست ملے۔ کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ اس اصول کے تحت بعض مخصوص معاشی اور معاشرتی قواعد و ضوابط مدوّن کئے گئے ہیں۔ جو اس زمانے کے سماجی حالات کے متن میں بنیادی اصول کی اصلی غرض و غایت کی تکمیل کرتے تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں ہمارا فرض ہے کہ اصول کی روشنی میں قواعد کو جانچتے رہیں اور دیکھتے رہیں کہ متبدل حالات میں مروجہ قواعد سے اصول کی حقیقی غرض و غایت کی تکمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو کس طرح ان میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اصول کا اصل مقصد فوت نہ ہو۔ تجارتی لین دین اور وراثت کے قواعد اسی اصول کے تابع ہیں اور اسی کے مطابق انھیں رکھنے کی ضرورت ہر زمانے میں پیش آتی ہے فقہ کا اصول ہے۔

لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان و تغیر الامکنہ والا حوال

(اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احکام میں تبدیلی، رہائش کی تبدیلی اور حالت کی تبدیلی سے لازم آتی ہے۔)

قرآن اقبال کے ذہن میں سرائیت کیا ہوا ہے اور ان کی فکر کے ہر پہلو پر اس کا گہرا اثر ہے اسی لئے ان کا تصوف بھی قرآن سے ماخوذ اور اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ تصوف کے دو اہم مسلک ہیں۔ ایک مسلک کا مقصود حقیقت مطلقہ میں جذب ہے۔ اس مسلک کے صوفی اپنی خودی کو حقیقت منتہائی میں ضم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ خودی کے قیود و بند سے رہائی حاصل کر کے الٰہیاتی فضاء کی لامحدود وسعتوں میں گم ہونا چاہتے ہیں۔ خدا سے وصل کی تمنا انھیں بے تاب رکھتی ہے۔ لامحدود میں کھو جانے کی آرزو انھیں تڑپاتی رہتی ہے۔ ان کی نظر میں نجات خودی سے نجات ہے ان کا ایقان ہے کہ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

رَو دَرُو گم شو وصال اینست و بس

یہی ہدایت ان کی رہبری کرتی ہے۔ یہ مقصود اقبال کے لئے کشش نہیں رکھتا۔ وہ کہتے ہیں:

من ذوقِ ہم آغوشئ دریا نہ خریدم   آں بادہ کہ از خویش رباید نہ چشیدم

(اقبال)

وہ انسان کی خودی کو حقیقی قدر کا حامل سمجھتے ہیں۔

نقطۂ نورے کہ نام اُوِ خودی است　　　زیرِ خاک ماشرارِ زندگی است

اُن کی نظر میں انسان کا نصب العین خودی کا تحفظ و بقا اور اس کی مسلسل ترقی ہونا چاہیئے۔ اسی لئے وہ تصوف کے دوسرے مسلک کے حامی ہیں۔ اِس مسلک کا مقصود قرب خداوندی ہے۔ وہ خدا میں فنا ہونا نہیں اس سے ربط رکھنا چاہتے ہیں اور اس سے قربت کے متمنی رہتے ہیں۔ اور اپنی خودی کی تقویت و استحکام کے لئے خدا سے استعانت کرتے رہتے ہیں۔ خدا سے قربت صوفی کے لئے سر چشمہ مسرت ہے۔ ایسی مسرت جس سے قلب متلذ ذ ہوتا ہے مگر جس کے اظہار سے زبان عاجز ہے۔ اس نوعیت کے متعلق اس سے سوال کیا جائے تو اس کا جواب یہی ہوتا ہے کہ

ذوق ایں بادہ ندانی بخداتا نہ چشی

اس کی صرف یہ خواہش رہتی ہے کہ یہ مسرت نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں ازدیاد ہوتا جائے اس کے لئے وہ خدا سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ اور خدا کی سمت سفر جاری رکھتا ہے۔ خدا لامحدود ہے اور اس کی طرف سفر بھی لامحدود ہے۔

جرمن صوفی ECKHART کہتا ہے:-..........

AUND KANN DIE EVIGE SCHON HEIC

NUR DIE EVIGE SCHNMCHT NABREN

(حسن ازل سے صرف تمنائے دائمی قرب حاصل کرسکتی ہے) مولانا روم اور اقبال کے لئے ربط اور قربت کا مقصود ہی کشش رکھتا ہے۔ ربط کے لئے یہ ضروری ہے کہ خودی قائم رہے اور دوئی برقرار۔ رومی کا یہ شعر ربط کی عکاسی کرتا ہے۔

من وتو بے من وتو جمع شویم از سرِ ذوق　　　خوش و فارغ زخرافاتِ پریشاں من وتو

(رومی)

اسکے بعد کا شعر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اِس سّری قربت کے باوجود ان کی خودی قائم ہے

ایں عجب ترکہ من وتوبۂ یکے کنج اینجا　　　اندریں دم بہ عراقیم وخراساں من وتو (رومی)

اس ممکنہ قربت کے باوجود میری خودی قائم ہے۔ میں، میں ہوں اور وہ، وہ۔ میرا اس سے تعلق

ربط کا ہے، وصل کا نہیں دونوں مسالک پر غور کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لئے یہ سوال ناگزیر ہے کہ قرآن کس مقصود کی تائید کرتا ہے۔ وہ انسان کو جذب کی دعوت دیتا ہے یا ربط کی۔ اس سوال کا جواب وہی دے سکتے ہیں جو قرآن کے معانی و مطالب میں غواصی کر چکے ہیں۔ یہاں صرف آیۃ کریمہ پیش کرتا ہوں جو اقبال اور رومی کے مسلک کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔

دَعْوٰهُمْ فِيهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ج وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ع (س۱۰ آیت۱۰)

اس منظر میں محدود ایغوؤں کی ایسی جماعت کو پیش کیا گیا ہے جو ایک طرف تو آپس میں ہم آہنگی اور خیر سگالی کے جذبات سے مربوط ہے اور دوسری طرف ایغوئے مطلق کے لئے جذبات استحسان اور تشکر سے سرشار۔ اور عالم وارفتگی میں جذباتِ تشکر وحیرت کا اظہار بے ساختہ کلمات سے کرتے ہیں۔ مومن دیدار الٰہی کا متمنی رہتا ہے مگر کیا حواس ظاہری سے جمالِ خداوندی کا نظارہ ممکن ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے لیکن اس کی تجلی کی جھلک اس کی آیات میں دیکھ سکتے ہو آیات دو قسم کی ہیں ایک تو آیاتِ قرآنی اور دوسرے آیاتِ فطرت جو ارض وسماء پیش کرتے ہیں دونوں قسم کی آیات میں ایک صفت مشترک ہے کہ دونوں خدا کی طرف متوجہ کرتے اور اس کی تجلی کو منعکس کرتے ہیں۔ فطرت خدا کی جلوہ گاہ ہے اس لئے مظاہر فطرت کو آیات کا درجہ دیا گیا ہے اور قرآن میں انسان کو بار باران کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اور جو لوگ ان سے بے اعتنائی کرتے ہیں انھیں ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ
(س۱۲ آیت۱۰۵)

ترجمہ: خدا کی کتنی نشانیاں ارض وسماء میں تمہارے سامنے ہیں اور تم ان سے روگردانی کرتے ہو۔

اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. (س۴۵ آیت۳)

صوفی ان آیاتِ فطرت میں خدا کی جھلک دیکھتا ہے اور انھیں خدا سے قربت کا ذریعہ بتاتا ہے۔ حسنِ فطرت میں حسنِ ازل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر حسین منظر میں اسے تجلی یزدانی نظر آتی ہے۔

مگر تو شانہ زدی زلفِ عنبر افشاں را — کہ بادِ غالیہ سا گشت وخاک عنبر بوست
(حافظ)

صوفیانہ ذوق محض جمالیاتی ذوق نہیں اس میں لاہوتی ذوق کے طاقتور عنصر کا امتزاج ہے۔ وہ دونوں قسم کے ذوق سے مرکب ہے۔صوفی کی نظر میں آیاتِ فطرت کا مشاہدہ اور ان سے کیف اندازی وہ لازمی زینہ ہے جسے طئے کئے بغیر وہ آخرت میں جمال خداوندی کا مشاہدہ نہیں کر سکے گا۔ ایک قدیم صوفی کا شعر اس نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔

امروز ندیدی تو اگر روئے صنم را فردا بقیامت رُخِ جاناں چہ شناسی

صنم تجلی یزدانی کا وہ عکس ہے جو آیاتِ فطرت میں نظر آتا ہے۔غالب کہتے ہیں

ہمچوراز ے کہ بہ مستی ز دِل آید بیروں در بہاراں ہمہ بوید و صبا می آید

ایک انگریز ادیب نے کہا ہے!

"IN THE TINIEST LEAF THERE IS ENOUGH MORE THAN ENOUGH TO SATISFY ALL OUR HUNGER"

اسلام کے متعلق اقبال نے اپنی نظم ونثر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں اسلام کے دو رُخ ہیں جو قرآن میں پیش کئے گئے ہیں۔ پہلا رخ ابدی ہے جو زماں ومکاں سے ماورا ہے اور اقدارِ کُلی کا حامل ہے اس میں ترمیم اور کمی وبیشی کا کسی انسانی فرد یا جماعت کو اختیار نہیں۔اسی رُخ کے متعلق قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ......"مُصدِّ قالِمَا بَیْنَ یَدَیْہِ ہے۔اس رخ کو قرآن میں دین قیم کہا گیا ہے۔

مَا تعبُدُ وْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُم وَ ا بآ ؤُ کُم مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بھا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تعبُدُ و آ اِ لَّآ اِیَّاہُ ؕ ذٰلِکَ الدِّ یْنُ الْقَیِّمُ ولٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ۔ (س-- ۱۲، آیت ۴۰)

خدا کے سوا جن علتوں سے تم تخلیق وتنظیم کائنات منسوب کرتے ہیں وہ سب تمہارے ذہن کی پیداوار ہیں۔جنھیں حقیقت کائنات سے کوئی تعلق نہیں.........

COSMIC EVLOUTION......ELAN VITAL..........DIALECTIC........ یہ توجیہی تصورات۔انسانی ذہن کی تخلیق ہیں اور حقیقت سے معرّا۔جس نظام فکر میں ان کی تشکیل کی گئی ہے۔ ان کی قدرو قیمت اسی کی حدتک ہے۔صرف خدا حقیقت مطلقہ ہے۔صرف اس کی عبادت کرو یہی دین

قیم ہے۔اور یہی اسلام کا ابدی رُخ ہے اسلام کا دوسرا رخ وہ ہے۔ جو تاریخی متن میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہی مخصوص زمانہ کے سماجی رسم و رواج معاشی و معاشرتی حالات سے متاثر ہے۔اس رخ کا اقدار ابدی رخ سے ماخوذ ہے اور اس کے تابع ۔اس میں ابدی رخ کو زماں و مکان کی قیود میں پیش کیا گیا ہے ۔اور تاریخی واسطہ سے۔ملت اسلامیہ کے دوسرے رخ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ملت کی تنظیم و بقا کا اسی پر انحصار ہے مگر ابدی رخ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا اور اس سرچشمہ حیات سے توانائی حاصل کرتے رہنا نہ صرف ملت کے بقا بلکہ اس کا مسلسل ارتقاء کا ضامن ہے۔ابدی رخ کی روشنی میں ہم ثانوی رخ کو بدلے ہوئے حالات سے مطابق کر سکتے اور اس کی قوت محرکہ کو بلا کم و کاست برقرار رکھ سکتے ہیں۔ دونوں رخوں میں امتیاز کرنے سے ہی ہم بعض استوار دینیاتی مسائل کو بھی حل کر سکتے ہیں بعض دینیاتی حلقوں میں یہ خیال ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں ناسخ ہیں اور جو ان سے اختلاف رکھتی ہیں وہ منسوخ ہیں۔قرآن پاک کی سالمیت پر جو اعتقاد رکھتے ہیں وہ کسی آیت کریمہ کو منسوخ نہیں تسلیم کر سکتے۔

بے شک ارشادِ خداوندی ہے کہ بعض آیات منسوخ کر دی گئیں اور بھلا دی گئیں مگر یہ آیات قرآن میں نہیں جو آیات بھلا دی گئی ہیں وہ کیسے موجود ہو سکتی ہیں۔ جن آیات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔وہ اس وجہ سے ہے کہ بعض آیات اسلام کے ابدی رُخ سے متعلق ہیں اور بعض اس کے تاریخی رخ سے دونوں اپنے اپنے متن میں کامل جواز رکھتی ہیں اور ہمارے لئے واجب التعمیل ہیں۔مگر یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اِن آیات کا تخاطب تمام انسانوں سے ہے یا صرف ملت اسلامیہ سے۔ جو آیات اسلام کے ابدی رُخ سے تعلق رکھتی ہیں عالمگیر نوعیت کی ہیں۔اور وسیع ترین عمومیت کی حامل ۔ یہ ہر انسان کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ملّت سے مخصوص آیات کی روشنی میں ان کی اہمیت گھٹانا یا ان کی تجدید کرنا اسلام کی مرکزی تعلیم سے انحراف ہے۔ ان آیات میں نجات و مغفرت کی لازمی شرائط پیش کر دی گئی ہیں۔اور جو انسان ان کی تکمیل کرے نجات کا مستحق قرار دیا گیا ہے البتہ روحانی ارتقاء کی اعلیٰ تر منزلوں تک رسائی کے لئے ملّت سے مخصوص آیات سے موثر امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔اسی لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ملّت سے رابطہ مستحکم رکھے اور وہی عمل کرے جس سے ملت کے استحکام کو تقویت ہو اور جو اس کے تحفظ اور ترقی میں ممد و معاون ہو۔اب چند آیات پیش کی جاتی ہیں جو ابدی رخ کا آئینہ دار ہیں۔

(۱) ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ،

وَ یَھْدِیْھِمْ اِلَیْہِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا. (س۴ آیت ۱۷۵)

ترجمہ: ''پس جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اسے مضبوط پکڑ لیا، انہیں تو وہ عنقریب اپنی رحمت اور فضل میں لے لے گا اور انہیں اپنی طرف کی راہ راست دکھا دے گا۔'' (س۴ آیت ۱۷۵)

(۲) ۔ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ. (س۲۲ آیت ۵۰)

ترجمہ: ''پس جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان ہی کے لیے بخشش ہے اور عزت والی روزی۔'' (س۲۲ آیت ۵۰)

(۳) ۔ وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ.

(س ۲۷ آیت ۷۳)

ترجمہ: ''یقیناً آپ کا پروردگار تمام لوگوں پر بڑے ہی فضل والا ہے لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔''

(۴) ۔ وَاِلٰھُنَا وَاِلٰھُکُمْ وَاحِدٌ..... (س ۲۹ آیت ۴۶)

ترجمہ: ''ہمارا رب اور تمہارا رب ایک ہی ہے......

(۵) ۔ وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْھَہٗ اِلَی اللّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ط وَاِلَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ. (س ۳۱ آیت ۲۲)

ترجمہ: ''اور جو (شخص) اپنے آپ کو اللہ کے تابع کر دے اور ہو بھی وہ نیکوکار یقیناً اس نے مضبوط کڑا تھام لیا، تمام کاموں کا انجام اللہ کی طرف ہے۔'' (س ۳۱ آیت ۲۲)

(۶) ۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا ط وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ.

(س ۴۱ آیت ۴۶)

ترجمہ: ''جو شخص نیک کام کرے گا وہ اپنے نفع کے لیے اور جو برا کام کرے گا اس کا وبال بھی اسی پر ہے اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ (س ۴۱ آیت ۴۶)

(۷) ۔ شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ (س۴۲ آیت ۱۳)

(۸) ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ. (س۵ آیت ۶۹)

ترجمہ: ''مسلمان، یہودی، ستارہ پرست اور نصرانی کوئی ہو، جو بھی اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے وہ محض بے خوف رہے گا اور بالکل بے غم ہو جائے گا۔''

ان روح پرور آیات سے جو اتنی واضح اور شفاف ہیں کہ ان کی ایک ہی تعبیر ممکن ہے۔ اسلام کی دو خصوصیات مترشح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام تمام انسانوں کے لئے کشادہ دامن ہے۔ دوسرے وہ ارتقائے انسانیت کے لئے زبردست قوت محرکہ فراہم کرتا ہے اقبال کو یہ دو خصوصیات بے حد عزیز تھیں اور کوئی اقدام جو اُن کی تقلیل یا تحدید کی سمت ہو ان کے لئے نا قابل برداشت تھا وہ دینیات کے مخالف نہیں تھے بلکہ اسے آئین ملت کا محافظ اور نگہبان سمجھتے تھے اور یقین تھا کہ بغیر آئین سے وابستگی کے نظامِ ملت برقرار نہیں رہ سکتا۔

ملت را رفت چوں آئیں زِدست   مثل خاک اجزائے اُوازھم شکست

(اقبال)

انھیں دینیات پر اس وقت اعتراض ہوتا ہے جب اس پر اصرار مناسب حد سے تجاوز کر جائے اور اسلام کی کشادہ دامنی میں کمی اور اس کی قوت محرکہ میں کاستگی کا باعث ہو۔ دینیات' دین کے سمندر کو کوزہ میں سمونے کی کوشش کرتی ہے۔ کوزہ بھی کارآمد ہے۔ گھر میں تشنگی رفع کرنے ہم کوزہ سے ہی کام لے سکتے ہیں۔ سمندر کو دعوت نہیں دے سکتے سمندر کو صرف منصور دعوت دے سکتا ہے۔ غلطی اس وقت ہوتی ہے کہ جب ہم کوزہ کو سمندر سمجھ لیں اور اپنے میدانِ نظر کو اسی تک محدود کر دیں۔ روح انسانی کی بنیادی تشنگی کی حقیقی تشفی سمندر سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے دین سے مسلسل ربط قائم رکھنا اور اس کی روشنی میں دینیات میں ضروری ترمیم و اصلاح کرتے رہنا ضروری ہے۔ دینیات ایک منجمد ضابطہ ہے اور دین ایک سیل رواں۔

سیل رواں کے ساتھ رہ کر ہی انسان نئی منزلیں طئے کر سکتا ہے اور وجود کی بلند تر سطح پر رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن کا وعدہ ہے کہ لَتَرْ کَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَق ؕ (س ۸۴ آیت ۱۹)

یہ وعدہ اس زندگی کے لئے بھی ہے اور حیات بعد الممات کے لئے بھی۔

قرآن میں انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنائے۔ انگریز ادیب سمرسٹ مام نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی طویل زندگی سے صرف ایک سبق سیکھا ہے اور وہ RESIGNATION یا تسلیم کا ہے۔ لیکن محض تسلیم' انفعالیت کو تقویت دیتی اور عمل کی تحریک مہیا نہیں

کرتی۔قرآن نے اس خامی کودور کردیا ہے۔اور تسلیم پر ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے کہ صرف تسلیم کافی نہیں اس کے ساتھ دوسرے انسانوں کی بھلائی اور امداد میں بھی سرگرم رہنا چاہیئے۔اقبال بھی خودی کی ترقی اور تکمیل کے لئے دونوں پر زور دیتے ہیں۔انسان کے دو فرض ہیں۔ایک تو وہ ان حالات و واقعات پر جو اس کے قابو سے باہر ہیں' صابر و شاکر رہے اور دوسرے اپنی قوتوں کو از دیادِ خیر اور فلاحِ انسانی کے لئے استعمال کرتا رہے یہی عمل صالح ہے جو وسیلہ نجات ہے۔

☆

''یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال بدقسمتی سے کہا جاسکتا ہے ایسے میں رونما ہوا جب مسلم حکماء کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے۔دنیائے اسلام میں تحریک ذہنی عملاً اس وقت مسدود ہوگئی اور یورپ نے مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا یورپ میں ''جذبۂ انسانیت'' کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ بھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین ''جذبہ انسانیت'' کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے' اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جاسکتا ہے''۔

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسلامیات کے نصاب کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے نام اقبال کے ایک خط سے اقتباس)

❁❁❁

اقبال اور عصری تقاضے

اقبال کی زندگی میں ابتداء سے آخر تک دو طاقتور جذبات عمل پیرا رہے۔ ان کی ذہنی زندگی کا تسلسل اور وحدت اُنہی جذبات کے مرہون ہیں۔ ان کی والہانہ شاعری اور افکار عالیہ کے محرکات انہیں جذبات سے ماخوذ تھے۔ ایک جذبہ تو وہ بے پناہ محبت تھی جو انہیں اسلام اور ملت اسلامیہ سے وابستہ کی ہوئی تھی۔ انہیں اسلام اور اسلام کے سرچشمہ قرآن کی بنیادی صداقت پر ایقان کامل تھا۔ انہیں اس میں رمق برابر شبہ نہیں تھا کہ قرآنی تعلیم ہی انسان کو اعلیٰ ترین اقدار کے تحقق اور مثالی انسانیت کی منزل مقصود کی طرف رہبری کر سکتی ہے۔ مسلمانوں سے انہیں شدید جذباتی وابستگی اس وجہ سے تھی کہ مسلمان حامل قرآن ہیں اور قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت توضیح و تفہیم کو اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زبوں حالی اور ملت اسلامیہ کے انتشار کا بھی شدید احساس تھا۔ اس سوال کی خلش انہیں ہمیشہ بے چین رکھتی تھی کہ کیوں وہ قوم جو اس بیش بہا تعلیم پر دسترس رکھتی ہے اس سے مستفید نہیں ہوتی اور ترقی کے ایسے موثر ذریعہ سے بہرہ مند ہونے کے باوجود مائل بہ پستی ہے۔ اس سوال نے اقبال کو جس ذہنی کشمکش میں مبتلا کیا اس کا عکس ان کی شاعری اور افکار دونوں میں نظر آتا ہے۔ ملت اسلامیہ جس مرض کا شکار ہوئی تھی اس کے اسباب و علل کی انہیں تلاش رہی۔ اور یہ تلاش کافی نتیجہ خیز بھی رہی۔ قرآنی تعلیم کی افادیت اور قدر و قیمت کے تعلق سے کسی شک و شبہ کا گزر ان کے ذہن میں نہیں ہوا۔ لیکن مسلمانوں کی صلاحیت اور اہم اور غیر اہم متن اور حواشی میں امتیاز کرنے کی قوت کے تعلق سے ان کی بدگمانی بڑھتی گئی۔ انہیں محسوس ہونے لگا کہ قرآن کی عینک سے جو اسلام دلکش، دلفریب طرب انگیز کشادہ دامن، حوصلہ افزاء، تمنا پرور حرکت خیز، وحدت زا اور وسعت آفاق کا حامل نظر آتا ہے چشم مسلم کے توسط سے دیکھیں تو وہ مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ جس کی خصوصیات تنگی نظر، تنگی داماں، تفرقہ پروری، سلاسل ماضی میں گرفتاری، فکر و عمل کی بندش حال سے بے

اعتنائی مستقبل سے روگردانی وقدامت پرستی میں غلواور تغیر سے خوف زدہ ہیں۔ان دوتصویروں کے فرق بلکہ تضاد سے اقبال کس قدر متاثر ہوئے اس کا اظہار انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

گریز از مسلمانان گریز اندر مسلمانی مسلمانان روا دارند کافر ماجرا ایتھا

جوصورت حال درپیش تھی اقبال نے اس کا مقابلہ دومحاذوں پر کیا۔جذباتی محاذ پران کی پیہم کوشش تھی کہ اسلام سے مسلمانوں کی وابستگی کومضبوط اور مستحکم کیا جائے۔ان کے دلوں سے احساس کمتری کودور کیا جائے۔انہیں باور کرایا جائے کہ اپنے ماضی سے شرمندہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ان کی تاریخ محض فسق وفجور، کشت وخون جوردواستبداد کی داستان نہیں۔اس میں ایسے درخشاں دور بھی ہیں کہ جب کہ تخلیقی قوتوں کوغلبہ تھااور دنیا کی ذہنی قیادت کاانھوں نے کامیابی سے دعوی کیا تھا عقلی محاذ پرانھوں نے جومہم شروع کی اس کا مقصد یہ تھا کہ قرآنی تعلیم کوخشو وزوائد۔غلِ وغش اور دقتی لواحقات سے پاک وصاف کرکے اس کا حقیقی دلکشی کے ساتھ جلوہ گر کیا جائے۔انسان کی ذہنی توانائیوں کوابھارنے کی جو قوت اس میں بالقوہ ہے اسے بالفعل کیا جائے۔اوراسے مسلمانوں کے قلوب میں جذب ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔اقبال کو یقین کامل تھا کہ اگر مسلمان قرآنی تعلیم کواس کے اصلی روپ میں دیکھیں توان کی قلب ماہیت ہوجائے گی اوردوہرشاہراہ ترقی پرگامزن ہوجائیں گے۔اوران زنجیروں سے جن سے انھوں نے اپنے ذہن کوجکڑ لیا ہے رہائی حاصل کریں گے۔ان دومحاذوں پر اقبال کو یکساں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔جذبات کو برانگیختہ کرنا نسبتاً آسان ہے عقل وفہم کوحرکت میں لانا بہت زیادہ دشوار ہے۔جذباتی محاذ پراقبال نے شاعری کاحربہ استعمال کیا۔ان کی ابتدائی نظمیں شائع ہوتے ہی مسلمانان ہند کے دلوں میں اترگئیں۔ان کا یہ شعرخودان کے کلام پرصادق آتا ہے کہ۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

عام مسلمان اُن کے کلام کے گرویدہ ہوگئے اور حلقہ علماء میں بھی اس کی مقبولیت کسی طرح کم نہیں تھی۔عام مسلمان اور عالم دونوں ان کے اشعارسن کرسردھنتے اور دلوں میں اسلام سے جوشِ عقیدت کاتموج وتلاطم محسوس کرتے تھے۔ازخواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز۔یہ وہ للکار تھی جس نے عالم وجاہل دونوں کوچونکادیااور ماضی کے خواب شیریں سے بیدارکرکے انہیں حقیقت حاضرہ

سے مقابل و متصادم کر دیا۔ اس محاذ پر تو اقبال نے کامیابی حاصل کر لی اور مسلمانوں کو عصریت کے دوبدو لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب دوسرا مسئلہ در پیش ہوا کہ مسلمانوں کو ساز و سامان مہیا کیا جائے جس کے ذریعہ سے وہ عصریت اور اس کے تقاضوں سے کامیابی سے نمٹ سکیں۔ اور آج کی دنیا میں بھی وہی مقام حاصل کر سکیں جو انہیں کل کی دنیا میں حاصل تھا۔ اقبال کو یقین کامل تھا کہ اس ساز و برگ کے لئے کسی اور تصوراتی نظام، کمیونزم یا جمہوریت سے رجوع ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ عصریت سے مقابلہ کے لئے وہ ضروری اسلحہ قرآنی تعلیم اور اسلامی تصوراتی نظام سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اب تک اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کے اساسی اصول اور کلیدی تصورات کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان کا موثر استعمال کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس صورت حال سے مقابلہ کے لئے انھوں نے دوسرا محاذ کھول دیا اور اس پر انھوں نے تخلیقی فکر اور بصیرت کے حربے استعمال کئے۔ قرآن ان کی نظر میں ایک بحر عمیق تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ساحل پر خزف چننے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس کی گہرائیوں میں غواصی کے ذریعہ گوہر نایاب کے متلاشی رہیں۔ ناکامی پر مایوس نہ ہوں اور رومی کے ہم نوا رہیں۔ ''چیزے کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست'' اقبال نے ان افکار پر سیر حاصل تنقیدی تبصرہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ وہ قوم کے قابل افراد اس کمی کو پورا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم ان نقاط کا تعین کرنا ہے۔ جن پر اقبال کا تصور اسلام مروجہ اسلام سے مختلف تھا۔ قرآن میں ابدیت اور عصریت کے مابین ایک نازک توازن قائم کیا گیا ہے۔ اور دونوں کو مساوی اہمیت دی گئی ہے'' الیوم کما کان '' میں ابدیت کا اثبات ہے تو کُل یوم ھو فی شان '' میں حقیقت زمان پر اصرار۔ زمان مایا اور فریب نظر نہیں بلکہ خدا کی تخلیقی فعلیت کا لازمی پہلو ہے۔ خدا سے صحیح ربط و تعلق قائم کرنے کی سمت میں پیشرفت اسی وقت ممکن ہے کہ ایک طرف تو اس کی ابدی ذات سے شعور چار ہے اور دوسری طرف اس کی شان کو جو زمانہ حال میں جلوہ گر ہے سمجھنے کی پر خلوص کوشش جاری ہے۔ اقبال کو افسوس تھا کہ مسلمان اس نازک توازن کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ اور کسی مخصوص زمانہ میں خدا کی جو شان جلوہ ریز تھی اس سے ابدیت منسوب کر کے زمانہ حال کی شان خداوندی سے تغافل اور بے اعتنائی کے مرتکب ہوئے۔ عصری تقاضے زمانہ موجودہ کی الہیاتی شان کے لازمی نتائج ہیں اور یہ

تقاضے زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتے ہیں اور سماجی تنظیم بین التخصی روابط معاشی اور معاشرتی قواعد اور ضوابط میں مناسب تبدیلیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تاکہ ایک طرف فرد اور سماج میں اور دوسری طرف طبعی اور بین الاقوامی حالات میں توافق اور تطابق قائم رہے۔ جس پر انسان کی بقاء کا انحصار ہے۔ کوئی ذی حیات بالخصوص انسان فطرت کے اس مطالبہ سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا کہ مطابقت قائم رکھو یا فنا ہو جاؤ۔ اس مطالبہ سے بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں پر زوال اور انحطاط کے سائے پڑنے لگے۔ جو فنا کے پیشرو ہیں۔ دوسرا نقطۂ اختلاف اور زیادہ معنی خیز اور خیال انگیز ہے عام نقطہ نظر سے قرآن کے تمام اجزاء ایک ہموار سطح پر قائم ہیں اس لئے ان کی اضافی قدر و قیمت کے تخمینہ کا سوال نہیں پیدا ہوا۔ برخلاف اس کے اقبال کی نظر میں اسلام کا صحیح تصور اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ ہم اس کی روح اور صورت میں فرق و امتیاز کریں مسلمان سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ اسلام کی روح کو اپنے دل میں جذب کرے اور فکر و عمل کی قوت اس سرچشمہ سے حاصل کرے۔ روح کا فطری رجحان اظہار کی طرف ہے مگر یہ اظہار زمانی شرائط کے تحت اور زمانی حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس اظہار کو وہ صورت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ صورت کی قدر و قیمت کے خلوص دل سے معترف ہیں مگر اس کو روح کے مقابل ثانوی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اسلام ان کی نظر میں ایک سیل رواں ہے۔ حرکت پیہم اور فعلیت مسلسل ہے۔ علماء کی یا کم از کم ان کی اکثریت کی نظر میں اسلام ایک جامد تصوراتی نظام ہے۔ یہ تصورات اعلیٰ ترین قدر کے حامل، کامل اور بے نقص ہیں۔ اس لئے ان میں تغیر کا دخل ممکن نہیں۔ ان کا ادعا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا حامل ہے۔ یعنی جن قواعد و قوانین اور اصول پر وہ مشتمل ہے وہ ابدی ہیں۔ اور تغیرات زمانہ سے بے نیاز۔ اقبال کے نقطہ نظر سے مکمل ضابطہ حیات' خارج از امکان ہے۔ کیونکہ حیات ہر روز حیات نو ہے۔ اور اس الہیاتی شان کا عکس ہے جو اس وقت جلوہ گر ہے۔ مکمل ضابطۂ حیات کا مطالبہ جائز ہے۔ جائز مطالبہ صحیح سمت میں رہبری کا ہے اور یہ رہبری قرآن کی روح فراہم کرتی ہے۔ روح سے ان کی مراد قرآن کے حقیقی معنی اور ابدی عناصر ہیں۔ اور زمانی تجدیدات کے دائرہ میں ان کا اطلاق اور تعین صورت منزل مقصود کی سمت میں پیش رفت دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک تو مقصد تطابق یعنی انسان کے ذہن میں مقصود اور اس کی سمت کا واضح اور روشن تصور اور اس کے

حصول کی پر خلوص خواہش موجود ہو۔ مقصد تطابق کے لئے اسے بالکلیہ طور پر قرآن سے رجوع ہونا چاہیئے۔ دوسری چیز توقع تطابق ہے یعنی جملہ امکانی وزمانی حالات کا جائزہ لے تاکہ اس کا عملی اقدام ان کے مطابق ہو اور کامیابی سے ہم آغوش ہو۔ اس بارے میں بھی وہ قرآن ے مدد کا طالب ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر اپنی ذہنی صلاحیتوں پر انحصار کرے۔ اقبال اسی تقسیم کار کی حمایت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ مقصود کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے ہر اقدام کے لئے خود اپنی عقل وفہم سے رجوع ہوں۔ اقبال کے دینی افکار میں ایک خاص مقام ان خیالات کو ہے جو انھوں نے وحی اور ختم نبوت کے تعلق سے ظاہر کئے ہیں چونکہ ان خیالات کو علمی طبقہ میں کافی شہرت حاصل ہوئی ان کی تشریح غیر ضروری ہے لیکن نظریہ نبوت سے جو نتیجہ انھوں نے اخذ کیا ہمارے موضوع بحث سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ انسان اس وقت تک اپنے ذہنی ارتقاء کی کئی منازل طئے کر چکا ہے سابق میں ہر منزل پر انسان کی ذہنی صلاحیتیں اتنی کم مایہ تھیں کہ وہ بغیر ہدایت ربانی کے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔ خاص طور پر وہ خارج سے اخلاقی رہنمائی کا محتاج تھا۔ رسول اکرمؐ کے زمانہ میں اس کی عقل اور ذہنی توانائی اس بلند درجہ کو پہونچ گئی تھی کہ وہ بغیر تائید غیبی کے اپنی آئندہ راہ عمل کا تعین کرنے کا قابل ہوگیا۔ اب اسے آزادی فکر وعمل عطا کردی گئی اور وہ اپنے اعمال کے لئے پوری طرح جوابدہ ہوگیا۔ اگر اقبال کے اس ذہنی موقف کو ہم تسلیم کریں تو اس سے مفر نہیں کہ عقل کے دائرہ عمل کو بہت زیادہ وسیع کردیں۔ اور دنیوی ہی نہیں دینی معاملات میں اور مسائل میں بھی اسے دخیل کردیں۔ قرآن میں انسان کو اپنی ذہنی صلاحیتیں استعمال کرنے کی بار بار ہدایت کی گئی ہے۔ اس کی توجہ ان آیات یزدانی پر جوارض وسماء پیش کرتے ہیں تکرار کے ساتھ منعطف کرائی گئی ہے ۔حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان آیات سے روگردانی نہ کرے اور ان کا مشاہدہ اور ان پر غور وفکر اپنا فرض سمجھے۔ ان اشارات کے باوجود روایت پرستی کے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے مسلمانوں میں عقل کا دائرہ عمل بہت محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ ان کے معاشی‘ معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل میں عقل موثر حصہ نہیں لے سکتی تھی۔ اور ان مسائل کا بار جسد اجتماعی پر روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ اقبال کی مسلسل کوشش رہی کہ عقل کو مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں اس کا جائز موثر مقام دیا جائے۔ انھوں نے اپنے نظریہ کے ذریعہ

دین اسلام سے عقل کا رشتہ مضبوط اور مستحکم کیا۔ عقل کے دائرہ عمل کو انھوں نے اتنی وسعت دی کہ حیات اجتماعی کا ہر پہلو اس کے زیر نگیں ہو گیا باوجود اس کے اقبال یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عقل ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو وحی نے متعین کئے ہیں۔ اقبال نے عقل اور دین کا جو نیا رشتہ قائم کیا اس سے دونوں کے تصادم کا سد باب اور دونوں کے باہمی تعاون و تعامل کا راستہ نکل گیا اقبال نے ایک دفعہ شاعرانہ دعویٰ کیا تھا۔ ''دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے''۔ عجب نہیں کہ ان کی حقیقت بین نظر جن صداقتوں پر پڑی ان میں یہ امکان بھی ہو کہ عقل اور اس کے مصلحہ نتائج دین کی تکمیل کا باعث ہو سکتے ہیں اور دین کے مقاصد کے حصول میں موثر مدد دے سکتے ہیں۔ سطور بالا میں اقبال کے بعض افکار پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے جس کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ عام دینیاتی فکر سے کن نقاط پر وہ انحراف کرنا اور نئی دریافت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اقبال کے افکار عام مسلمانوں کے ذہن میں نفوذ نہیں کر سکے۔ بلکہ وہاں تک رسائی بھی حاصل نہیں کر سکے۔ شاعری کے ذریعہ تو اقبال نے مسلمانوں سے ربط قائم کیا لیکن ان کی فکر اس رابطہ سے الگ اور منفرد رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے افکار اور مسلمانوں کے درمیان ایک آہنی دیوار حائل رہی یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ یہ دیوار کس نے اور کیوں کھڑی کی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ اس پر غور تفرقہ پروری کا باعث ہو گا۔ اور پہلے ہی ملت اسلامیہ بیسویں تفرقوں سے نگار وختہ ہے اور قرآن کا حکم ہے کہ ''اقیمو الدین ولا تفرقوا''۔ اس لئے بہتر ہے کہ اقبال کے ہم خیال اس سوال پر غور کریں کہ اس دیوار کو کس طرح ڈھایا جا سکتا ہے۔ تاکہ اقبال کے حیات بخش افکار نسیم جانفزا کے جھونکوں کی طرح مسلمانوں کے ذہن میں گذر کریں۔ اور اس کو تازگی و شادابی بخش سکیں۔ اقبال کے قدرداں جو اس کی یاد منا رہے ہیں کے افکار ان کو مسلمانوں پر مسلط کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف اس جانب ان کی توجہ منعطف کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے خیالات قابل قبول نہ سہی قابل غور یقیناً ہیں۔ ان کی بلندی فکر اور ژرف نگاہی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اسلام نے جس رنگ میں اقبال کو مسحور و مفتون کیا تھا ان کی مدد سے اس کی کسی جھلک کا نظارہ کریں۔ اور جو شمع انھوں نے روشن کی تھی اپنی بساط کی حد تک اس سے اکتساب ضو کریں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کے خیالات کے خلاف علماء کے طبقہ سے کوئی صدائے مخالفت بلند نہیں ہوئی اور نہ کسی عالم دین نے ان کے افکار پر

تنقیدی تبصرہ سپرد قلم کیا۔ ان کا ردعمل صرف سکوت کا رہا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سکوت سکوت قدر شناسی تھا۔ اقبال صدی کے منانے والے اگر اس مہر سکوت کو توڑ سکیں تو بلا شبہ یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ خواہ اس کا نتیجہ مخالفانہ تنقیدات اور معاندانہ تبصرے ہی ہوں۔ ملت اسلامیہ کے سمجھدار افراد سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اصل رائے اور اس پر اعتراض دونوں کا منصفانہ موازنہ کریں گے۔ اور قوم کی صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کریں گے۔ قوم خود دیکھے گی کہ اقبال قصۂ دارا و سکندر کو نہیں دھرا رہے ہیں بلکہ حکایت مہر و وفا کو اس تابندہ اور شگفتہ رنگ میں پیش کر رہے ہیں کہ خاص و عام کے لئے جاذب توجہ اور محرک وجدان ہو اور ہر قلب تمنائے لم یزل سے مرتعش اور مضطرب ہو جائے۔

☆

"ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستان سعدی اور دیوانِ حافظ۔ مگر اب "جاوید نامہ" کو بھی پانچویں کتاب سمجھنا چاہئے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانے میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے"۔

(محمد اسلم جیراج پوری)

❀❀❀

A note published in the journal 'Islamic Culture'

(1978-1979)

During the last five decades, the Muslim world has been in intellectual ferment. At the beginning of the period the Muslim intelligentsia awake to the fact that they could no longer postpone a difficult choice. They had to decide whether they should held fast to traditionalism or should blaze a new trial. The clash was between sentiment and reason. The Muslim intellectuals set themselves to reconcile the two powerful forces in human nature. They addressed themselves to the task of preserving the values cherished by the Muslims community and also equipping it to meet the challenge of modern knowledge and technology. The journal of Islamic Culture provided a forum for Muslim intellectuals of all shades of opinion, to discuss the difficult problems that confronted the Muslim community. Distinguished Muslim scholars from all parts of the world have contributed articles illuminating different aspects of the problems. However, the problems still eludes resolution. Nevertheless an effective way of tackling them has been discovered and is being explored. It is now realized that instead of skimming over the surfaces, we should search for the deeper meaning of the Quran. A close of the Quran highlights the dual aspect of the Revelation - the eternal and the temporal. The eternal is valid for all time as it is beyond

time. The temporal is pertinent to a particular social situation at a particular time and place. Failure to distinguish and keep the balance between the two sides has created many problems which have hampered the progress of the Muslim community. By putting both aspects at the same level Muslims have not fully recognized the reality of change and consequently have found it difficult to adapt themselves to change. Of course both the eternal and temporal aspects of the Quran are important, but for different reasons. The eternal aspect constitutes the care of the Islamic ideology and should never be tempered. The temporal aspect too has value but not inherent value. Its value is derived from its relation to the eternal. We should pay careful attention to the temporal aspect, for learning how it has been fitted into the frame-work of the eternal. All socio-economic regulations pertain to the temporal aspect and are time-bound. They can be changed to suit the new conditions, provided their meaningful relationship with the eternal aspect is not disrupted. The eternal aspect is the region of faith and reason should never be permitted to encroach on it. Outside it, reason should have full scope for free activity. It should not be subject to any restrictions. With the allotment of separate sphere to faith and reason, the possibility of their clashing with each other can be ruled out. The Muslim community would get rid of many vexed problems, such as the inviolability of the personal law and the prohibition of interest in any form. These problems can be solved in the light of the ideal and directives which emanate from the eternal aspect. For example the directive of justice insists that no one should be deprived of an iota of what is due

to him. If interest does not contravene this law, it should be permitted.

The identity of Muslim community is based on its allegiance to the eternal aspect of the Quran. A Muslim who rejects any apart of it, automatically ceases to be Muslim. In the temporal aspect there is room for differences of opinion; but difference of opinion in this sphere should not be stigmatized as schism. The adoption of this view will permit dissent within reasonable limits, and will bring the different sects in Islam closer to each other. It will also open the way to the establishment or amicable relations between Muslims and the followers of other religions. The Quran had invited the followers of other religions to gather on a common platform, on the basis of a few fundamental beliefs. If this invitation had been accepted in good faith, it would have ushered a new era, an era of peace and progress. After centuries of senseless blood-shed, conditions are again favourable for the renewal of the invitation. A call to unite on the basis of an ideology which satisfies the basic carving of man, is likely to be heeded now as the socio-economic ideologies have failed to satisfy him.

The journal of Islamic Culture, during the last fifty years has been contributing to the exposition and critical assessment of the Islamic ideology. The present seminar, held in connection with its Golden Jubilee celebrations marks the culmination of its efforts in this field.

❁❁❁

Osmania University
Diamond Jubilee Celebration
1978-79
Citation

Professor M. Salahuddin

A student of the University's first batch, Prof. Salauddin had an outstanding academic record having passed in First Division the Matriculation, Intermediate and B.A. Degree Examinations of the University. Sent to Dacca University on a merit scholarship in recognition of his academic brilliance he topped the list of successful candidates at the M.A. (Philosophy) Examination held in 1925 in which year he proceeded for higher studies to England on a Government scholarship. He was a Research Student at Oxford University and on his return from England appointed Lecturer in English and Philosophy at the University in 1931; he became Reader in Philosophy in 1949, and In-charge Head of the Department of Philosophy in 1958. After his retirement from the University in 1959, he continued to devote himself to research, and at present he is Secretary of the Islamic Culture Board, Dairetul Maarif. In presenting this memento to him Osmania University places on record its appreciation of the signal achievement of a brilliant Osmanian and dedicated teacher of the University. He is also honoured as a student of the first batch of Osmania University.

Hyderabad
July, 9, 1979

Prof. G. RAM REDDI
Vice-Chancellor

اقبال اکیڈیمی کا خبر نامہ

***

ممتاز عالم دین ڈاکٹر سلمان ندوی کی اقبال اکیڈیمی میں آمد

SUNDAY 14 DEC 2014

رہنمائے دکن

THE RAHNUMA-E-DECCAN DAILY

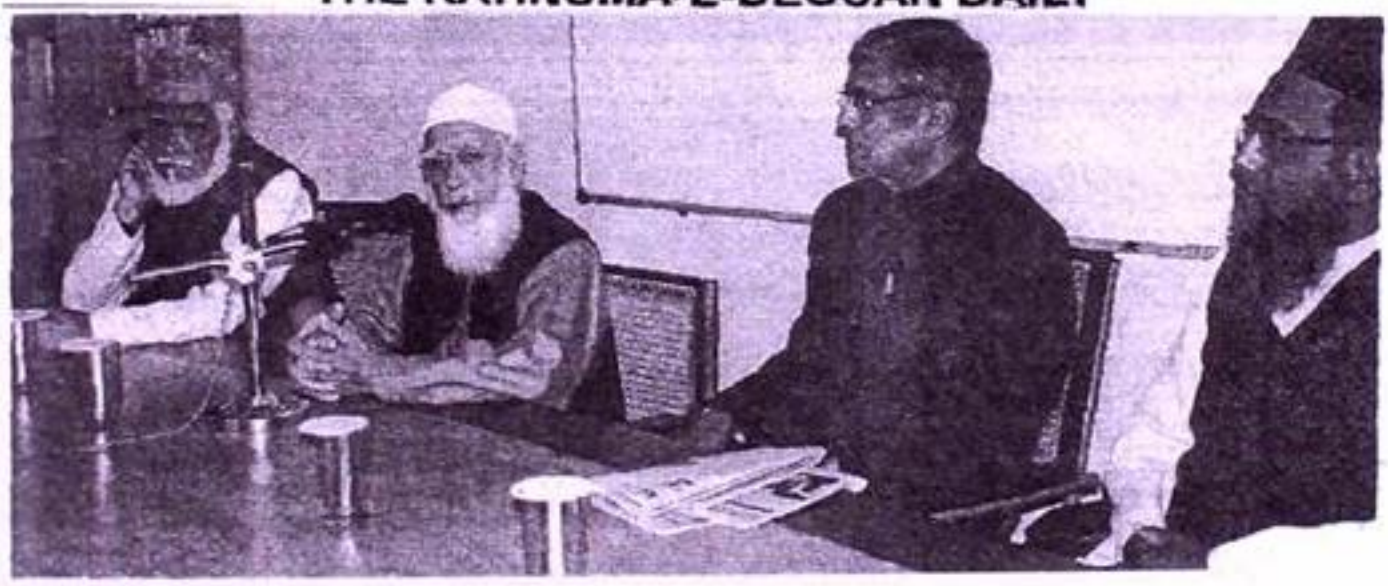

جنوبی افریقہ میں مقیم ممتاز عالم دین ڈاکٹر سلمان ندوی اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد میں دانشوروں، صحافیوں اور مصنفین کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر ندوی 20 ویں صدی کے جید عالم مولانا سلیمان ندوی کے فرزند ہیں، جن کی خطبات مدراس سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بے حد مشہور ہے۔ ڈاکٹر سلمان ندوی نے قرآن مجید اور اسلامی لیٹریچر کے انگریزی تراجم کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے مل جل کر کام کرنے کی تلقین کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر شاہد علی عباسی، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد، سید فاضل حسین پرویز بھی موجود تھے۔

شہ نشین پر پروفیسر محسن عثمان ندوی، جناب ضیاء الدین نیر اور ڈاکٹر راشد حسین ندوی دیکھے جاسکتے ہیں۔

گلبرگہ میں اقبال اکیڈمی کا قیام
اکیڈمی کا مقصد فکر اقبال کا فروغ: ضیاءالدین نیر

گلبرگہ (۱۲/فبروری، ۲۰۱۵) اقبال شاعر صرف شاعر مشرق نہیں بلکہ وہ شاعر اسلام اور شاعر انسانیت ہیں۔ امت کی نشاۃ الثانیہ کے لئے فکر اقبال کا فروغ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اقبال اکیڈمی کا یہی مقصد ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف اسکالر و ماہر اقبالیات ضیاءالدین نیرؔ، نائب صدر اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے گلبرگہ میں اقبال اکیڈمی کے قیام کے سلسلے میں لکچر ہال، مسلم چوک میں منعقد اجلاس میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ نوجوان نسل اپنے اکابرین کے کارناموں سے ناواقف ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل کو درخشاں ماضی سے روشناس کرایا جائے۔ تاکہ وہ روشن مستقبل کی طرف گامزن ہوسکیں۔ اقبال کی انقلابی فکر اس سلسلے میں رہنمائی کرتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ علامہ اقبال نے اپنے سارے قلمی و ذہنی شعوری سفر میں جس بات پر سب سے زیادہ افسوس کا اظہار کیا ہے وہ ''امت مسلمہ'' کی زوال پذیری اور اس کے اسباب ہیں۔ اقبال مسلمانوں کے زوال پر صرف ماتم کناں ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو اپنی شکست وریخت سے سبق سیکھنے کی راہ قرار دیتے ہوئے انہیں خاص طور پر نوجوانوں کو سرمایہء مستقبل قرار دیتے ہیں اور بالخصوص ان سے خطاب کرتے ہوئے حالات پر اثر انداز ہونے کے لئے راہ بتائی۔

ضیاءالدین نیر نے اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ 1959 میں اسے خلیل اللہ حسینیؒ نے اسے قائم کیا۔ تب سے لے کر آج تک سیمنارس، سمپوزیمس، لکچرس اور نشر واشاعت کے ذریعہ یہ فکر اقبالؒ کی ترویج وتبلیغ میں مصروف عمل ہے۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد میں ایک وسیع ترین لائبریری اور اسٹڈی سینٹر ہے جس میں مختلف اسلامی اور علمی موضوعات پر زائد از ساٹھ ہزار کتابیں ہیں۔ اقبالیات پر چھ ہزار سے زائد کتابیں ہیں جو لاہور کی اردو اکیڈمی کے بعد دنیا بھر میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ گلبرگہ میں اقبال اکیڈمی کے قیام کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے مرکزی اقبال اکیڈمی کی جانب سے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اقبال کیڈمی گلبرگہ کے لئے اقبالیات پر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تحفتاً

پیش کیا۔

جناب ایاز الشیخ ، رکن اقبال اکیڈمی حیدرآباد و چیرمین امام غزالی ریسرچ فاونڈیشن نے کہا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں جو بنیادی کردار علامہ اقبال کے افکار و اشعار نے ادا کیا ہے تاریخ اسے فراموش نہیں کرسکتی۔ برطانوی سامراج کے چنگل میں فکری، نظری، ثقافتی اور سیاسی تسلط میں گرفتار امت مسلمہ کے لیے علامہ محمد اقبال نے جو چراغ روشن کیے اس کی روشنی اور کرنیں آج بھی با آسانی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے قرآنی تعلیمات اور صدر اسلام کو اپنا منشور اور آئیڈیل قرار دے کر برصغیر پاک و ہند کی نوجوان نسل میں ایسی روح پھونکی کہ وہ نہ صرف اپنی خوابیدہ صلاحیتوں سے آشنا ہوا بلکہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے میدان عمل میں گامزن ہوگیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اقبال نے اسلامی دنیا کے مسائل کا عملی حل وہی پیش کیا جو قرونِ اولی میں کامیاب ثابت ہو چکا تھا۔ اقبال کے پیغام کا خلاصہ اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یوں ہوگا کہ مسلمانوں کو اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہوگا!۔

معروف دانشور اور ماہر تعلیم جناب عبدالحمید فاران نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دانائے راز علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے سب سے بڑے اردو شاعر ہیں۔ اقبال بطور اسلامی مفکر ایک خاص مقام کے مالک ہیں۔ اسلامی فکر نے اقبال کی شاعری کو سوز و گداز اور خاص کیفیات کا حامل بنادیا۔ انہوں نے کہا کہ کلامِ اقبال اقبال اسلامی افکار اور فلسفیانہ خیالات سے معمور ہے۔ نظری خودی، عرفانِ ذات، تسخیرِ کائنات، کشمکشِ خیر و شر، تصورِ فقر، تصورِ عشق وغیرہ شاعری سے زیادہ افکار کے زمرے میں آتے ہیں۔ گلبرگہ میں اقبالؒ اکیڈمی کے قیام کو انہوں نے بہترین قدم قرار دیتے ہوئے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

جلسہ میں شریک دانشوران ملت اور نوجوانوں کے رائے سے اقبال اکیڈمی گلبرگہ کی اڈھاک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس میں قوام الدین جنیدی ایڈوکیٹ عرف وہاج بابا، محمد سمیر اقبال، حافظ عبدالرحیم، ساجد حسین، محسن سہروردی، عبدالرحیم جاگیردار، اطہر معز، اور علیم خضر شامل ہیں۔ قبل ازیں جلسہ کا آغاز قراءت کلام پاک اور نعت شریف سے ہوا۔ ایڈوکیٹ وہاج بابا نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اجلاس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ سمیر اقبال کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔ شہر کے مختلف حصوں سے آئے علمی و ادبی شخصیات اور دانشوروں خصوصاً نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد نے اس اجلاس میں شرکت کی۔

اورنگ آباد میں اقبال اکیڈیمی ولائبریری کا قیام

''اقبال کی شاعری حوصلہ اور امیدوں کی شاعری ہے۔ فکر اقبال ملت اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ اور عروج کا پیغام ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جناب عبدالرحیم قریشی، صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت اسسٹنٹ سیکٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اورنگ آباد میں اقبال اکیڈیمی ولائبریری کے قیام کے موقع پر منعقدہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ جناب ضیاء الدین نیر نے اورنگ آباد میں اقبال اکیڈیمی ولائبریری کے قیام کے فیصلے پر ذمہ داروں کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ علامہ اقبال کی فکر نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ اقبال نے پوری زندگی اسلامی اصولوں اور اقدار کے فروغ میں گذاردی۔ اقبالیات کے حوالے سے ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں کافی تحقیقی کام ہورہے ہیں۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد بھی اس سلسلے میں سرگرم عمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ شہر اورنگ آباد میں اقبال اکیڈیمی اور لائبریری کا قیام اہم ہے۔ انشاء اللہ اہل اورنگ آباد اس سے مستفید ہونگے۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک ونعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ بعد ازاں بدست جناب عبدالرحیم قریشی، لائبریری ودفتر اقبال اکیڈیمی کا افتتاح عمل میں آیا۔

اقبال اکیڈمی کو عطیہ کردہ کُتب

سلسلہ نشان	عطیہ منجانب	جملہ تعدادِ کتب	جملہ تعدادِ رسائل
۱	پروفیسر فریدہ زین صاحبہ	۲۳۸	۵۷۵
۲	جناب محی الدین احمد صاحب جناب ارمان فاروقی صاحب	۳۱۴	......
۳	پروفیسر معین الدین عقیل صاحب	۱۰۹	......
۴	جناب عمیر عبدالعزیز صدیقی صاحب	۵۸	......
۵	جناب عبدالعزیز سبحانی صاحب	۱۱۸	......
۶	جناب احمد محی الدین صاحب	۱۵۰	......

Vol : 25 Issue : 1
April 2015

ISBN : 81-86370-62-5

IQBAL REVIEW

[Journal of the Iqbal Academy Hyderabad]

April 2015

IQBAL ACADEMY
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank, Hyderabad - 28.